۲۲۸

ملک محمد [illegible]
لطیفہ خانم صدیقی

میری لائبریری

عکسِ اقبال

تصانیفِ اقبال کے عمیق
مطالعے کی روشنی میں
پیام اور تعلیماتِ اقبال

میری لائبریری ہی میں
پہلی بار

عکسِ اقبال

مُصنّفین

ملک محمد عظیم پی، سی، ایس

لطیفہ خانم صدیقی ایم، اے

مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

جملہ حقوقِ اشاعتِ دائمی بحق مصنفین محفوظ ہیں

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

طابع : آلِ بشیر پرنٹرز لاہور ۲

بار اوّل : ۱۹۷۵

انتساب

پسران و دخترانِ عزیز

سعد۔ وقار۔ شہلا اور تسنیم کے نام

جن کی محنتِ شاقہ اور عزمِ صمیم کا جذبہ اس کتاب

کی تکمیل میں ہمارے لئے ہمت افزا رہا۔

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

فہرستِ مقالات

۱	پیش لفظ	۹
۲	علامہ اقبال سوانح اور پسِ منظر	۱۹
۳	ابتدائی اردو کلام	۲۹
۴	حکیم مشرق	۴۲
۵	اقبال اور اقوام مشرق	۶۲
۶	عالم شرق و غرب ۔ اقبال کی نظر میں	۷۴
۷	دانائے راز	۸۸
۸	تسخیر کائنات	۱۰۴
۹	اسلامی روایات	۱۱۹
۱۰	مشکل پسندی	۱۳۰
۱۱	فلسفۂ خودی	۱۳۹

۱۲	فلسفۂ خودی اور تصورِ ملت	۱۵۳
۱۳	الٰہیت اور عبادت	۱۶۵
۱۴	مذہب کیونکر ممکن ہے	۱۷۲
۱۵	مذہبی تجربے کی ماہیت اور خصوصیات	۱۷۷
۱۶	روحانی تجربے کا منطقی جواز	۱۸۲
۱۷	انسانی شخصیت کی بے پناہ قوت	۱۸۷
۱۸	نظریۂ اجتہاد	۱۹۳
۱۹	مسلم کلچر	۱۹۹
۲۰	شاعر کا خواب	۲۰۸

پیش لفظ

ہماری پچھلی تصنیف "رہِ وادیٔ خیال" ۱۹۶۸ء میں چھپی، تب سے اب تک بحمد اللہ حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف کی کوئی ہمت افزائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا۔ ہمارے لئے یہی امر باعثِ طمانیت ہے کہ جن نظریات کو اُبھارنے کی کوشش اُس کتاب اور اُس کے پیش لفظ میں کی گئی تھی اُنھیں قوم نے کافی حد تک شرفِ قبولیت بخشا ہے۔ ادب اور مقصد کی تفصیلی بحث کے دوران یہ کہا گیا تھا کہ ادب میں مقصدیت اور تفریح کے عناصر کا حسین امتزاج موجود ہونا چاہئے۔ ادب کو محض تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھ لینا ادب کے بلند مقاصد کے خلاف ہے کسی اونچے مقصد کو حاصل کرنے کی سعی چاہے کتنی ہی دبی ہوئی لہر کی صورت میں کیوں نہ ہو لازمی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ادب کے ذریعے دیگر اعلیٰ مقاصد کے علاوہ

اگر اسلامی مساوات اور اسلامی سوشلزم یا اسلامی روایات اور روحانی تجربات کا پرچار بھی کیا جائے تو بھی اُس ادیب کو گردن زدنی قرار نہیں دیا جانا چاہیے کیونکہ علامہ اقبالؒ نے بھی تو اسلامی مساوات کے گیت گائے ہیں اور خود قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے قیام کے بعد واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ پاکستان میں اسلامی سوشلزم کی بنیاد پر معاشرہ ترتیب دیا جائے گا۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ اسلامی مساوات و روایات یا اسلامی سوشلزم کا نام لینے والوں کی اس قدر سرکوبی کی فکر کی جائے کہ ان کا حشر دیکھ کر کوئی اور ان باتوں کا ذکر تک نہ کر سکے۔

ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ حالات کے دھارے نے صحیح رُخ پر پلٹا کھایا ہے اور ہمارے ملک میں اب ایسی صورت درپیش ہے کہ اسلامی روایات اور اسلامی سوشلزم اور اسی طرح اسلامی روایات اور روحانی تجربات کا نام لیا جانا کسی طرح بھی غلط تصور نہیں کیا جاتا۔ ہم اس بات کا دعویٰ تو نہیں کرتے کہ یہ سب کچھ ہمارے زورِ قلم کا نتیجہ ہے یا اس قسم کے خیالات کے پرچار کو گناہ نہ سمجھنے والے ادیبوں کا مجموعی طور پر جادو ہے کہ ملک کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور استحصال کا چاہے وہ زراعت میں ہو تجارت میں ہو یا ملازمتوں میں واضح طور پر خاتمہ شروع ہو گیا ہے۔ اس عمل کے مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگتا ہے اس بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔ بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہمارا خونِ جگر رائگاں نہیں گیا اور قوم کو ترقی کی صحیح سمت مل گئی۔ اس سلسلے میں ملک کو صحیح اور نہایت جاندار قیادت کا مل جانا بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ہمارے لئے یہی صلہ بہت کافی ہے کہ قوم کو ترقی و تعمیر کی نئی راہیں مل گئیں۔ اگر قوم و ملک زندہ و

پائندہ ہیں تو اپنی انفرادی مشکلات اور بے وجہ مخالفتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں چونکہ ان میں پائیداری کا ناپید ہونا لازمی امر ہے۔ سچ اور حق آخر اپنا اثر کرتا ہے اور فتح آخر حق کی ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟
وہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں

دہقان کی عظمت اور مزدور کی شان کو اس سے زیادہ خوبصورت طریقے پر اور کون بیان کر سکتا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ محنت کرنا اور پیداوار میں اضافے کی سعی کرنا خدائی صفات کو اپنانے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ انگریز حاکموں کی بخشش ہوئی جاگیریں چاہے وہ زمینداریوں اور جاگیرداریوں کی صورت میں ہوں چاہے نوابی اور خان بہادری کے القابات کی صورت میں، انھیں زمین کا یا اُس پر بسنے والے لوگوں کا حاکم یا مالک نہیں بنا سکتیں۔ زمین تو سب اللہ کی ہے اور اُس سے فائدہ

اُٹھانے یا اُس کی ملکیت کا حقدار وہی ہے جو اُس پر خدائی صفات کو بروئے کار لاتے ہوئے محنت و مشقت کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مالکِ ارض و سما کے طفیل، روزی پہنچانے کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ زرعی اصلاحات کے تحت وسیع و عریض قطعہ ہائے اراضی جو بڑے بڑے زمینداروں اور جاگرداروں کی بے توجہی کی وجہ سے بنجر پڑے تھے اور بے توجہی کا شکار تھے، اب مزارعین کو تقسیم ہو چکے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ اصلاحات میں اراضی فی فرد کی بجائے اراضی فی کنبہ کے حساب سے حد مقرر کی جائے گی۔ جدید سے جدید مشینی آلات اور کھاد کے استعمال سے ویسے بھی زرعی انفرادی آمدنی بہت زیادہ بڑھ جانے کے مواقع ہیں لہٰذا زمین کی ملکیت کی امکانی حد کم سے کم مقرر ہونی چاہیے۔ آجکل کے حالات میں اگر اسے سو ایکڑ فی کنبہ کر دیا جائے تو کسی طرح بیجا نہ ہوگا۔ آمدنی کی مساوی تقسیم کے سلسلے میں یہ ایک نہایت اہم قدم ہوگا۔ اسی طرح ملوں اور فیکٹریوں کے مزدوروں کا جو حصہ ملک کی معیشت میں ہے اس سے انکار کرنا سوسائٹی کے ساتھ ظلم کے مترادف ہوگا۔ صحیح معنوں میں قوم کے پیداواری سیکٹر کے اہم رُکن اگر کوئی ہیں تو مزدور ہیں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اگر آمدنیاں اور تنخواہیں بڑھتی ہیں تو ہمیشہ موٹی موٹی توندوالے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے سرمایہ داروں یا اسی قبیل کے محفوظ مفادات کی بڑھتی ہیں۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ان سرمایہ داروں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اگر یہ لوگ مزدوروں کو مناسب تنخواہیں دے کر انھیں اسلامی طریقے پر خوش رکھتے جس کے وہ ہر لحاظ سے اہل تھے تو آج مزدور خود اُن کے حق میں مظاہرے کرتے اور اُن کی بقا کے لئے دعاگو رہتے لیکن افسوس اِن عاقبت نااندیش خدایانِ صنعت نے انتہائی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوٹ

کھسوٹ کا وہ بازار گرم کیا کہ الٰہی توبہ! غضب خدا کا کہ ایک مل کی آمدنی سے ایک دو سال ہی میں وہ ایک اور مل لگا لیتے تھے لیکن پیداوار کے اصل خالق یعنی ان کو دولتمند بنانے والے اصل کارکن بھوکے مرتے تھے اور چھ چھ ماہ میں ہی ملوں کی ناگفتہ بہ حالت' کام کی زیادتی، غیر تسلی بخش ماحول اور حقیر تنخواہوں کے سبب تپ دق میں مبتلا ہو جاتے لیکن شقی القلب اور سنگدل مل مالکان سے یہ نہ ہوتا کہ ان کی تنخواہیں اس حد تک بڑھائیں کہ ان کارکنوں کی زندگی عذاب نہ بنے۔ آخر مغربی یورپ اور امریکہ میں بھی تو بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں لیکن کیا انھوں نے اپنے کارکنوں سے کتوں سے بھی بدتر سلوک کیا؟

بنیادی اور بھاری صنعتوں مثلاً سٹیل ملوں، کھاد کی فیکٹریوں، الیکٹرسٹی اور گیس کمپنیوں، سیمنٹ اور بھاری انجنیئرنگ کے کارخانوں اور گھی کی ملوں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدامات نہایت مستحسن ہیں۔ اسی طرح بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا نہایت اہم صحیح اور بروقت اقدام ہے۔ ان اقدامات سے ایک طرف قومی خزانے کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا اس کے علاوہ بہت زیادہ سرمایہ حکومت کے ہاتھ آجائے گا جسے ملکی تعمیر و ترقی کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سمجھتے ہیں کہ ٹیکسٹائل ملوں اور کاغذ کی ملوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لینا چاہیئے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ بھاری اگر کوئی صنعت ہے تو وہ ٹیکسٹائل ملوں کی صنعت ہی ہے اور یہی صنعت اگر چاہتی تو مزدوروں کی فلاح اور کپڑے کے مناسب دام رکھ لینے کے باعث سارے ملک میں دیگر صنعتوں کے لئے ایک مثالی نمونہ پیش کر سکتی تھی کیونکہ جس قدر بے پناہ آمدن انھوں نے حاصل کی ہے شاید اور کسی نے نہ کی ہو لیکن تنخواہ دیتے وقت تو انھوں نے کبھی دور کی سوچی ہی نہیں۔ افسوس کہ انھوں نے نوشتۂ دیوار پڑھا ہی نہیں۔ علامہ اقبال

نے کیا صحیح فرمایا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الحُوط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چُن چُن کر بنائے مُسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لُٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

"رہِ وادیِ خیال" کے پیش لفظ میں یہ سوال بھی اُٹھایا گیا تھا کہ ترقی کے مراکز اور بنیادی آسائشیں صرف بڑے بڑے شہروں مثلاً کراچی، لاہور اور اسلام آباد تک ہی کیوں

محدود ہیں اس سلسلے میں بھی صحیح قدم اُٹھایا گیا ہے اور DE CETERLISATION یعنی ضرورت سے زیادہ مرکزیت کو کم کرنے کے سلسلے میں چار صوبوں کے الگ الگ دارالسلطنت ہیں اور وہاں الگ بنیادی آسائشوں کے مراکز قائم ہیں اس کے علاوہ DECETERLISATION کی ایک اور نہایت اہم صورت یہ ہے کہ ہر ضلع کے تمام سب ڈویژنوں کو ضلع کا درجہ دے دیا جائے اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ ضلعی ہیڈ کوارٹر کی تمام آسائشیں مثلاً لڑکوں لڑکیوں کے کالج۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال اور ضروری صنعتیں اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ وغیرہ وہاں بھی قائم ہو جائیں گے۔ اخبارات اور کھیلوں کی ویسی ہی آسائشیں وہاں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ بجائے اس کے کہ صوبائی آمدن کے اضافے کے ساتھ ساتھ ہم صرف صوبائی سیکرٹیریٹ کے عملہ اور اخراجات میں بے پناہ اضافہ کرتے جائیں بہتر صورت یہی ہے کہ اس اضافی آمدن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم ہر سب ڈویژن کو ضلع کا درجہ دے دیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ شہروں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا بلکہ نئے اور پرانے ضلع کے صدر مقام کے لئے کم سے کم بنیادی سہولتوں کا ایک معیار مقرر ہونا چاہیئے جن کی وہاں پر فوراً ہی جلد از جلد ضروری قرار دی جائے۔ اسی طرح ان جملہ نئے ضلعوں میں تین تین سب ڈویژن یا تحصیلیں ہوں جنہیں سب ڈویژن کے درجے کی کم سے کم بنیادی آسائشیں بہم پہنچانے کا بہت جلد اہتمام کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل کے ضلعوں کے صدر مقام اس قدر زیادہ CONGESTED اور گنجان آباد ہو چکے ہیں کہ اس مرکزیت کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے اور ترقی کے نئے سے نئے مراکز قائم کرنا وقت کی آواز ہے۔

علامہ اقبال کی تقریباً تمام تصانیف نظم و نثر کا ایک مختصر سی کتاب میں تنقیدی تجزیہ پیش کرنا بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کرنے اور سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے

بہر حال اقبال کے شائقین اور طلبا اس حقیر کوشش کو انشاء اللہ اپنے مقصد کے لئے انتہائی ممد و معاون پائیں گے۔ علامہ اقبال نے اردو اور فارسی نظم میں دس کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں :-

۱۔ بانگ درا
۲۔ پیامِ مشرق
۳۔ جاوید نامہ
۴۔ ضربِ کلیم
۵۔ بالِ جبریل
۶۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مثنوی مسافر۔
۷۔ اسرارِ خودی
۸۔ رموزِ بے خودی
۹۔ زبورِ عجم
۱۰۔ ارمغانِ حجاز

ان کے علاوہ علامہ کے لیکچرز کا مجموعہ بزبانِ انگریزی بعنوان :-

RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHTS IN ISLAM

اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنی کہ اُن کی تصانیفِ نظم۔ اس میں شامل ساتوں لیکچر ایسے ہیں کہ ان کا ایک ایک لفظ ہیرے جواہرات میں تولے جانے کے قابل ہے۔ ان سب تصانیف اور لیکچرز پر الگ الگ ایک ایک مقالہ تحریر کیا گیا ہے جسے حسبِ حال عنوان دیا گیا ہے۔ ایک مقالہ اُن کے نہایت اہم سیاسی خطبے سے متعلق ہے۔ کتاب کو زیادہ مبسوط

بنانے کے لئے ایک مقالہ اُن کے حالاتِ زندگی سے متعلق بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ زبان کو عام فہم اور سادہ رکھا گیا ہے تاکہ اس عظیم مفکر کا پیغام بآسانی سمجھا جا سکے اور خصوصاً طلباء غیر فلسفی قسم کے خواتین و حضرات اس پر مکمل مہارت حاصل کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں۔

آخر میں یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ تصنیف "رہِ وادیٔ خیال" میں بطورِ مصنف صرف محمد عظیم کا ذکر تھا اور پیشِ نظر میں بیگم عظیم کے CONTRIBUTION کے سلسلے میں انھیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس پر اکثر و بیشتر اعزہ اور ملنے والوں کو یہ اعتراض تھا کہ جب CONTRIBUTION دونوں کی ہے جیسا کہ پبلشر نے اشارہ کیا ہے اور خود پیش لفظ بھی واضح طور پر اس کی غمازی کرتا ہے تو دونوں کا نام بطورِ مصنف درج کیوں نہیں کیا گیا لہٰذا اس بار دونوں کا نام بطورِ مصنف درج کر دیا گیا ہے اُمید ہے پُرانے اعتراض کی اب تلافی ہو جائے گی۔ تاہم ہمیں اس امر پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں کہ دوسرے فاضل مصنفین کی بیویاں بھی اپنے شوہروں کی تصانیف میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور نام صرف شوہروں کا ہو اور یا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ شوہروں کو توفیق دے تو وہ مصنف اور ادیب قسم کی بیویوں کی تصانیف میں بھرپور حصہ لیں اور نام صرف بیویوں کا ہونے دیں۔ آخر دونوں کے تعاون سے ادب کی کچھ خدمت ہو جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ادب تعمیری اور تخلیقی ہو تخریبی ہرگز نہیں ؎

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
دائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

مکتب و میکدہ جُز درس بنودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بُود

محمد عظیم - پی - سی - ایس
بیگم عظیم - ایم - اے

یکم فروری ۱۹۷۴ء ، لاہور

علامہ اقبال ---- سوانح اور پس منظر

ہندوستان میں سات سو سالہ اسلامی دورِ حکومت کے بعد ۱۸۵۷ء میں جب بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہوا تو اس کے ساتھ ہی برصغیر میں مسلمانوں کا زوال واضح طور پر شروع ہو گیا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک مسلمان بادشاہت کا خاتمہ ہوتا تو دوسری مسلمان بادشاہت معرضِ وجود میں آجاتی اور جب اُس کا عہد ختم ہوتا تو کوئی اور عظیم مسلمان فاتح اُٹھتا اور ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالتا۔ گویا محمد بن قاسم سے لے کر اورنگ زیب تک مسلمان بلاشرکتِ غیرے ہندوستان کے وسیع علاقوں پر حکمران رہے۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے وسیع علاقوں کی طرح ہندوستان بھی اسلامی عروج کے عہد کے زیرِ اثر آیا اور بلاشبہ اسلامی ہندوستان کو اس برعظیم کی تاریخ کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ خصوصاً مغلوں کے زمانے میں اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے عروج پر پہنچی۔ مغل عمارتیں، مصوری، ادب، موسیقی اور دیگر علوم و فنون

غرضیکہ مغلیہ دور میں اسلامی کلچر اپنے عروج پر پہنچا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اگرچہ مرکز میں مغلوں کی سلطنت باقی رہی اور مختلف ریاستوں میں بھی وسیع علاقوں پر مسلمان نواب اور سردار قابض رہے لیکن پھر بھی انگریزوں کا زور روز بروز بڑھتا گیا اور بالآخر ۱۸۵۷ء میں انگریز اپنی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور پھوٹ ڈلوانے کی کامیاب پالیسی کے باعث مسلمانوں کو شکست دے کر یہاں پر پورے ایک سو سال کے لئے براجمان ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد کو انگریز تو غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن وہ بلاشبہ ہندوستان والوں کے لئے جنگِ آزادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقامی آبادی کے ایک کثیر حصے نے بہادر شاہ ظفر کی زیرِ سرکردگی انگریزی راج کا تختہ اُلٹ دینے کی سعی کی لیکن ان کی سیاست کام آئی اور بہادر شاہ شکست کھا کر گرفتار ہوئے۔ اُن کے کئی بیٹوں عزیزوں اور سپہ سالاروں کو نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا گیا، خود انھیں اور ان کی بیگم کو رنگون میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ سقوطِ دہلی کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ غالب اپنے خطوط میں لکھتے ہیں کہ جملہ مسلمان آبادی کو شہر بدر کر دیا گیا اور بغیر تاوان لئے اور وفاداری کا یقین دلائے خوب چھان بین کئے بغیر کسی کو دوبارہ شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی مسلمانوں کی جائدادیں، خلعتیں اور جاگیریں وغیرہ ضبط کر لی گئیں۔ غرض یہ سانحہ مسلمانوں کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

اس شکست کے بعد مسلمانوں پر یاس و حرماں کا شدید سکوت طاری ہوا۔ انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون سے انھوں نے مکمل طور پر بائیکاٹ اس نقطۂ نظر سے کیا کہ وہ انگریزوں

سے سخت متنفر تھے اور ان سے مکمل طور پر الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ انگریز کی ملازمت کرنے کو انھوں نے کفر جانا یہاں تک کہ انگریزوں سے ملنے جلنے تک سے اجتناب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر کچُلا جائے، کیونکہ اگر انھیں خطرہ تھا تو صرف مسلمان قوم سے۔ مسلمانوں ہی سے اُنھوں نے سلطنت چھینی تھی اور انھیں یقین تھا اگر مسلمان قوم کو پوری طرح کچل نہ دیا گیا تو وہ اپنے خلاف اس جور و استبداد کا بدلہ ضرور لے گی۔ چنانچہ اس پالیسی کے تحت اُنھوں نے مسلمانوں کو ملازمتوں، تجارت کی سہولتوں اور دیگر سیاسی مراعات سے مکمل طور پر محروم کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اُنھیں اس نوبت کو پہنچا دیا کہ وہ صرف ماشکی، دھوبی، مزدور اور اِسی قسم کی چیزیں بن کر رہ گئے اور وہ دن دُور نہ تھے کہ اُن کا حشر بھی سپین کے مسلمانوں کا سا ہو۔

ایسے نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمان قوم کو چند ایسی شخصیتوں سے نوازا جنہوں نے مسلمانوں کی اس علیحدگی پسندی اور جدید علوم و فنون سے نفرت کے دور رس نتائج کو بھانپ لیا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ اس رویے کی وجہ سے ہندو قوم جو انتہائی چالاک اور عیار ہے، ترقی کی دوڑ میں مسلمانوں سے بہت زیادہ آگے نکل جائے گی اور ایک وقت ایسا آجائے گا کہ ہندو پورے ملک پر چھا جائیں گے اور اگر انگریز کبھی حالات کی مجبوری کے باعث ہندوستان سے بوریا بستر باندھ کر روانہ ہوئے تو ہندو ہی پورے ملک کے مالک بن بیٹھیں گے۔ چونکہ مسلمان دینی، تعلیمی اور اقتصادی بدحالی کے باعث کسی گنتی ہی میں نہ ہوں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے سر سیدؔ نے مسلمانوں کی اس علیحدگی پسندی کے رویے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اُنھوں نے علماء سے کفر کے فتوے بھی سُنے اور

اپنے آپ کو ابن الوقت بھی کہلوایا لیکن مسلمانوں کو صحیح راہ پر ڈالنے کے عزم کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ انھوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" میں جو اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے انگریزوں پر بھی واضح کیا کہ اگر بغاوت ہوئی تھی تو ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ انگریز حکمرانوں کی بھی اُس میں غلطیاں لازمی طور پر موجود تھیں۔ اُنھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کی پالیسی خود انگریزوں کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ صرف ہندو قوم کو اتنا زیادہ مضبوط بننے کا موقع نہ مل سکے کہ وہ انگریزوں کے لئے بھی مصیبت بن جائے اور ہندوستان کی دیگر قوموں کے لئے بھی بلائے جان۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو بھی جدید علوم حاصل کرنے پر اُکسایا اور ملازمتوں اور تجارت میں اپنا حصّہ حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اپنے انگلستان کے دورے میں اُنھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کا معائنہ کیا اور ہندوستان واپس آکر علی گڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی کھولنے کی مہم شروع کی جس میں جدید علوم و فنون کی تدریس کا انتظام کیا۔ چنانچہ اُن کی شب و روز کی محنت اور پُرخلوص جذبہ کے باعث علی گڑھ میں اینگلو محمڈن کالج کی بنیاد رکھی گئی جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طور پر وسعت پائی اور مسلمان قوم کے لئے گراں قدر خدمات کا باعث بنی۔

سرسیّد کے بعد سیاسی میدان میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، نواب وقار الملک نواب محسن الملک وغیرہ اور ادبی میدان میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور دیگر ادبا و شعرا آئے جنھوں نے مسلمان قوم کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر ان کے مناسب مقام تک پہنچایا اور پھر سے اُنھیں ایک باعزت اور باوقار قوم کی حیثیت بخشنے کی سعی کی۔

علامہ اقبال کا دردِ مسعود اس دور میں مسلمان قوم کے لئے رحمتِ آسمانی سے کم

نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مسلمان اپنی گذشتہ عظمت کو کھو کر ایک تو اتنے حرماں نصیب اور مایوس ہو چکے تھے کہ دُنیا اور مافیہا کو اپنے اوپر حرام سمجھے ہوئے تھے۔ انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد وہ یہ فرض کر چکے تھے کہ اب اُن سے ٹکر لینا بعث ہے اور شاید اب سات سو یا ہزار سال تک ان کی غلامی کا دور شروع ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی معرکۃ الآرا تصانیف سے مسلمان قوم کے دل میں ایک طوفان پیدا کر دیا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر کھو چکے تھے اور فرض کئے ہوئے تھے کہ اُن کے لئے کوشش کرنا اور جد و جہد کا راستہ اختیار کرنا ہی فضول ہے۔ علامہ اقبال نے اُنھیں روشنی دکھاتے ہوئے تسلی دی کہ عروج و زوال ہر قوم پر آتا ہے۔ اگر وہ اس وقت زوال کے مرحلے میں ہیں تو اس سے انتہائی طور پر پست ہمت ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دور بھی ہر قوم پر آیا ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس مرحلے پر ہم اپنے ہوش و حواس کھو نہ بیٹھیں بلکہ ہمت سے کام لیتے ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے اس زوال کے دور کو کم از کم عرصے تک محدود کر دیں اور راستے کی مشکلات کو عبور کرتے ہوئے ترقی کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ خوش قسمتی سے اسی دور میں قائداعظم محمد علی جناح جیسی عظیم سیاسی شخصیت بھی ہمیں مل گئی جس کی بے مثال رہبری و رہنمائی نے مسلمان قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو انتہائی مضبوطی سے سہارا دیا اور بالآخر ہم بحیثیت ایک قوم کے، قیامت خیز طوفان سے بچ نکلے اور انگریز اور ہندو کے استبدادی پنجے کو چھڑاتے ہوئے اپنا ایک علیحدہ وطن قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پورے طور پر اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور جہاں ہم آزادی کے سانس لے کر اسلامی تہذیب و ثقافت اور مذہب کی ترقی کے لئے کوشاں ہو سکے ہیں۔

علامہ اقبال جن کا پورا نام شیخ محمد اقبال تھا اور اقبال تخلص کرتے تھے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر کے ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تقریباً دو سو سال قبل مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور پنجاب میں آکر آباد ہوا تھا۔ علامہ اقبال کی زندگی میں پنڈت نہرو ایک مرتبہ لاہور آئے تو انھوں نے خاص طور پر علامہ اقبال سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور وہ بہت دیر تک کشمیری شخصیتوں کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ اس سے ان دونوں کا کشمیر سے گہرا لگاؤ بوجہ کشمیری النسل ہونے کے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علامہ اقبال کسی طرح علاقائیت کے قائل تھے۔ اپنے بزرگوں کے اصلی وطن کے بارے میں مناسب دلچسپی تو ہر شخص کے لئے فطری امر ہے۔ اس سے علامہ اقبال بھی مبرا نہ ہوں گے۔ لیکن جہاں تک ان کی تعلیمات کا تعلق ہے وہ نہ صرف علاقائیت پسند نہ تھے بلکہ نیشنلزم کے بھی خلاف تھے اور پان اسلامزم پر مبنی ملتِ اسلامیہ کے اور اس سے بھی ماورا آفاقیت کے قائل تھے۔ جیسا کہ اس کتاب میں شامل متعلقہ مقالات میں وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

مکتب کی ابتدائی تعلیم کے بعد اقبال سکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں مولوی میر حسن جیسا یکتائے زمانہ عربی و فارسی کا عالم انھیں مل گیا۔ ان کے والد شیخ نور محمد خود بھی ایک دیندار بزرگ تھے اور عربی و فارسی علوم اور مذہبیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، جس کا ذکر علامہ نے خود اپنے کلام میں بھی کئی جگہ کیا ہے ان کی ذات کا اثر بھی علامہ اقبال پر ظاہر ہے کہ بہت واضح طریقے پر ہوتا تھا۔ پھر ابتدائی مکتب کی تعلیم یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی مذہبی تعلیم سے انھیں بھرپور طریقے پر

فیض پہنچا۔ پھر جب انگریزی تعلیم کے لئے سکاچ مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے تب بھی خوش قسمتی سے مولوی میر حسن جیسا متبحر عالم انھیں مل گیا۔ گویا انگریزی اور دیگر علوم کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور مذہبیات سے انھیں بچپن ہی سے گہرا ربط رہا۔ انگریزی دور کے بعض پڑھے لکھے حضرات تو اس قبیل کے تھے کہ اس بات پر فخر کرتے کہ وہ نہ صرف انگریزی پر ہی عبور رکھتے ہیں اور اُردو تحریر بلکہ بول چال سے بھی تقریباً نابلد ہیں۔ اور یہ امر یقین جانئے کہ ان کے لئے کسرِ شان نہ تھا بلکہ اسے اپنی خاص بڑائی کے طور پر بتایا کرتے تھے کہ وہ تو اردو تحریر سے نابلد ہیں۔ انگریزی دور کو تو کیا یاد کرنا آجکل بھی انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوئے بعض نوجوان ایسے موجود ہیں جو اردو سے ناواقفیت کو اپنی شان بتاتے ہیں۔ انگریزی علم و ادب اور جدید علوم و فنون پر مہارت تو خیر ایک فخر کی بات ہوئی اور اس سلسلے میں کمال حاصل کر کے فخر کر لینا کوئی بری بات نہیں لیکن اگر فخر اس بات پر کیا جائے کہ وہ اردو سے ناواقف ہیں تو یہ کتنی شرمناک سی بات ہے اپنے ہی ملک اور اس کی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا کہاں کی عقلمندی اور بڑائی ہوئی۔ بعض وجوہ کی وجہ سے اگر آدمی اردو زبان سے نابلد بھی رہ جائے تو اس کی جائز وجوہ بیان کر کے معذرت کی جا سکتی ہے لیکن اگر فخریہ یہ بات کہی جائے کہ وہ تو اردو جیسی دیسی قسم کی زبان سے نابلد ہیں تو اسے کیا کہا جائے؟ شاید اس طرح یہ عالی نسب لوگ اپنے یورپی النسل ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں یا کچھ اور' واللہ اعلم بالصواب۔ ایک مرتبہ قائداعظم کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے تقریر کا آغاز اردو سے کیا وہ زیادہ عرصہ جنوبی ہند اور انگلستان میں رہنے کی وجہ سے اردو کے ایسے ماہر نہ تھے لیکن بہرحال انھوں نے اپنے طور پر بُری بھلی اردو میں تقریر کرنے میں انھوں نے بالکل عار نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر بعد انھوں نے کہا کہ

میں دیکھ رہا ہوں کہ غیر ملکی اخبار نویس کافی تعداد میں یہاں رپورٹنگ REPORTING کے لئے موجود ہیں چونکہ وہ اردو نہیں سمجھ رہے ہونگے لہٰذا ان کے استفادہ کے لئے میں اب انگریزی میں تقریر کروں گا۔ یعنی کس خوبصورت طریقے سے اُنھوں نے انگریزی میں تقریر کرنے کا جواز پیش کیا جس سے قومی عزت و ناموس کو ذرا بھی ٹھیس نہ پہنچی۔ پھر پاکستان بننے کے کافی عرصے بعد ایک اونچے قسم کے لیڈر کی تقریر سُننے کا اتفاق ہوا تو اچھی بھلی اُردو میں فرمانے لگے "چونکہ میری اُردو اچھی درست نہیں لہٰذا میں انگریزی میں تقریر کروں گا۔" گویا انگریزی ان کی مادری زبان تھی۔ پھر جوائنٹ شنٹ انگریزی کی ٹانگ اُنھوں نے توڑی ہے کہ اللہ توبہ۔ کاش یہ غلامانہ ذہنیت بہت جلد ہماری قوم کے دل و دماغ سے نکل جائے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے علامہ اقبال اس قسم کی ذہنیت کے بالکل برعکس نہ صرف انگریزی علوم مثلاً فلسفہ، بیرسٹری اور اقتصادیات وغیرہ کے ماہر تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو فارسی اور عربی میں بھی انھوں نے مہارت حاصل کی اور شعر میں اپنے زرّین خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی اردو فارسی ہی کو بنایا۔ انگریزی میں ان کے لیکچر بعنوان RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT IN ISLAM بھی اتنی ہی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جتنی کہ ان کی اُردو و فارسی نظم کی تصانیف۔ اور ہم سمجھتے ہیں ان کے خیالات کا تکمیلی جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی مندرجہ بالا دونوں قسم کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ انہیں اقتصادیات سے بھی بہت دلچسپی تھی اور ان کی سب سے پہلی کتاب الاقتصاد کے نام سے ہی پیش کی گئی۔

ایف اے کا امتحان اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج

لاہور میں داخل ہوئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کیا۔ گورنمنٹ کالج میں انھیں پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی کا فخر نصیب ہوا جن کی صحبت میں اُن کا فلسفیانہ کردار بنا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے اور کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر رہے۔ علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ مٹرنٹی کالج کیمبرج سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری لی اور پھر میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ کے قیام کے دوران انھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ کچھ عرصہ عارضی طور پر وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے اور پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن وکالت کی طرف ان کی توجہ برائے نام تھی۔ ان کا اصل میدان، بلکہ اسے خود علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "جنون" کہہ لیجیے، اُن کی اخلاقی اور اصلاحی شاعری تھا۔ جس کے طفیل انھوں نے ملتِ اسلامیہ کے احیا کی سعی کی۔ ان کی مختلف تصانیف سے متعلق علیحدہ مقالات اس کتاب میں شامل ہیں۔ اِس لئے اس جگہ ان کا الگ الگ ذکر ضروری نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اگر ہم اقبال جیسی عظیم شخصیت سے محروم ہوتے تو شاید اس برصغیر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ابھی صدیوں دُور ہوتی ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کاروں کو
شررِ فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

علامہ اقبالؒ کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مجلسِ قانون ساز

کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد کے اجلاس میں اپنا وہ تاریخی خطبہ پڑھا جس میں ہندوستان کی مشکلات کا حل پاکستان کی صورت میں پیش کیا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ گویا علامہ نے بھرپور زندگی بسر کی جس کے دوران اُنھوں نے ہر ممکن پہلو سے ملّت اسلامیہ کے استحکام اور نشاۃِ ثانیہ کی سعی پیہم کی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کے آخری ایام کا یہ قطعہ غیر فانی اہمیت کا حامل ہے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ابتدائی اُردو کلام

اسلامیانِ ہند کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے میں علامہ اقبالؒ کا جو حصّہ ہو سکتا ہے اُس کی ایک جھلک اُن کی ابتدائی تصنیف "بانگِ درا" کے مطالعے سے ہمیں صاف طور پر مل جاتی ہے۔ نظموں اور غزلوں کا یہ مجموعہ اگرچہ اقبالؒ کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے لیکن اُن کا تعمیری شعور، قومی جذبہ اور مذہبی خمار جس بھرپور طریقے سے اُن کی نظموں میں نمایاں ہوا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ اُن عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو کسی خوابیدہ قوم کی تقدیر یکسر بدل کر اُن کے دن سنوارنے کے موجب بنتے ہیں۔ اُن کی کوئی نظم بھی لے لیجئے وہ بے مقصد نہ ہوگی۔ اس میں ایک گہرا سبق اور ایک اونچا فلسفہ مضمر ہوگا جو قوم کے بیمار ذہن کے لئے اکسیر کی صورت رکھتا ہوگا۔

اُن دنوں کا قومی ذہن جن موذی بیماریوں میں مبتلا تھا۔ اُن میں اسلام کی اصلی روح کو چھوڑ دینا اور مُلّا کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا؛ جہدِ مسلسل سے گریز، تعصبات و

فرقہ بندیوں کی بھرمار۔ خودی اور قومی خودداری کی بجائے ظاہری ٹیپ ٹاپ اور لاف زنی پر بھروسہ اور وطنیت اور علاقائیت کے زہر کی دور رس تاثیر تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان سب امراض کی ایک ماہر نباض کی طرح صحیح صحیح تشخیص کی اور صحیح معنوں میں حکیم الاُمت بن کر ایک ماہر جرّاح کی طرح قوم کے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکنے کی سعی کی۔ اُنھوں نے اپنے عمل کے لئے شاعری کے نسخے کو آزمایا۔ یوں کہئے کہ انھوں نے شاعری میں ایک نیا تجربہ کیا۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر اس سے بہت بلند مقاصد حاصل کرنے کی سعی کی۔ حسن و عشق کی معاملہ بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک بیہوش قوم کو ہوشمند بنانے کا کام اپنی شاعری سے حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہوئے۔ اب تک تو کم و بیش یہی مفہوم لیا جاتا رہا تھا کہ شاعری نام ہی محبوب کے ذکر بلکہ اُس سے ہم کلام ہونے اور راگ رنگ کی محفلوں اور شراب و نغمہ کے خمار سے سرشار ہونے کا دوسرا نام ہے۔ سرشاری اور سرمستی تو اقبالؒ کے کلام میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہ مستی و سرشاری سطحی تفریح اور ظاہری حسن پرستی سے متعلق نہیں بلکہ ملّتِ اسلامیہ کی بگڑی ہوئی قسمت سنوارنے سے ہے۔ انھوں نے قوم و ملت کو کھری کھری سناتے ہوئے اُنھیں یاد کرایا ہے کہ اگر وہ خوابِ خرگوش سے بیدار ہو کر اپنی پرانی عظمتوں کو پالینے کے لئے دن رات جہاد میں مصروف نہیں رہیں گے۔ تو اُن کا نام و نشان بھی اِس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

بعض لوگ تو اب بھی شاعری اور ادب کو محض تفریح کا ہی ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کو شعریت یا ادبیت کے پہلو سے الگ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آجکل جو شخص بے مقصد ادب یا ادب برائے ادب کی رٹ الاپے جاتا ہے اور ادب برائے زندگی میں پنہاں عظیم فلسفے کو سمجھنے سے انکار

کرتا ہے اُس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ بیوقوفوں کی جنت میں رہ رہا ہے۔ دورِ حاضر میں جہاں ہر قوم و معاشرے نے چاہے وہ مشرق کی ہو یا مغرب کی اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس اہم راز کو پہچان لیا ہے کہ ملکی و قومی تعمیر و ترقی کے لئے ہر وسیلہ جس کا ایک اہم جزو شاعری اور ادب بھی ہے، بروئے کار لایا جانا چاہئے۔ اگر کوئی قوم اس پہلو کو نظر انداز کرے گی تو وہ لامحالہ باقی ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے رہ جائے گی۔ پرانے زمانے میں جبکہ یہ اہم نظریہ ابھی اتنا مقبول نہ ہوا تھا اور بیشتر اقوام میں شاعری و ادب صرف تفریحِ طبع کا ذریعہ ہی تھے وہاں اگر کوئی قوم اس نظریے کو اپنانے سے گریز کرتی تھی تو مقابلتاً اس سے اتنا زیادہ فرق نہ پڑتا تھا چونکہ باقی بھی اس حمام میں ننگے تھے لیکن اب جبکہ دنیا کی زیادہ تر اقوام بیدار ہیں اور شاعری و ادب کو مکمل طور پر ملکی تعمیر کے لئے بروئے کار لانے میں کوشاں ہیں وہاں اگر ہم اس میدان میں پیچھے رہ گئے تو دوسروں سے مقابلہ کرنا تو درکنار مرگِ مفاجات سے دوچار ہونا ہماری تقدیر ہوگی اور ہماری انفرادیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

ہمارے غیر ملکی آقاؤں اور اُن کی دیگر بھائی بند استعماری طاقتوں نے ہمیشہ اس نظریئے کو ملیا میٹ کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کی تاکہ کمزور اور محکوم اقوام اپنی قسمت پر شاکر رہیں اور شمشیر و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب ہی کے گرویدہ رہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے شعر و ادب کو ایک خواب آور، نشہ پرور اور رومان انگیز مشغلہ ہونے پر ہی زور دیا۔ اس سلسلے میں اقبالؒ کے مقابلے میں ٹیگور کو نوبل پرائز دیئے جانے کے اقدام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کس قسم کے بے مقصد ادب کی حوصلہ افزائی کے قائل تھے۔ ٹیگور کے رومانوں اور علاقائی ادب نے بنگالیوں پر افیون کا سا اثر کیا ہے اور

اگر اقبالؒ کی شاعری کی مجاہدانہ روح بہ حیثیتِ مجموعی قوم پر جاری وساری نہ ہوتی تو کوئی عجیب بات نہ تھی کہ اس ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ مکمل طور پر بکھر جاتا اور اس کا سہرا بجا طور پر مجیب ایسے لیڈروں کے علاوہ ٹیگور کے متذکرہ فلسفے پر ہوتا جو ایک رُوبزوال سوسائٹی کا آئینہ دار ہے اور جسے ہمارے سابق استعماری مالکوں نے یا وشِ بخیر نوبل پرائز کے انعام سے نوازا ہے۔

مبادا علامہ اقبالؒ کے درج بالا اور دیگر خیالاتِ زرّیں بغیر مناسب وموزوں مثالوں کے رہ جائیں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام سے چند ایک اہم اقتباسات قارئین کرام کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دئیے جائیں۔ معاشرے میں شاعر کے رول ۶ / ۱۸ سے متعلق آپ اُسے یعنی شاعر کو "جوئے سرود آفریں" سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں[۳]

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اُس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیٔ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

متحرک زندگی اور خاموش کام ایسے اہم انسانی خصائل ہیں کہ اگر انھیں قومی خصائل کے طور پر اپنا لیا جائے تو ہم ترقی کی منازل برق رفتاری سے طے کرتے ہوئے اپنی گزشتہ

اسلامی عظمتوں کو دوبارہ پالینے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستانی قوم ایک سُست الوجود جماعت کے طور پر مشہور تھی۔ انگریزوں کی غلامی نے ہمیں مکمل طور پر غلامانہ ذہن بخش دیا تھا۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے نہ کرنا۔ آرام طلبی کو عین شانِ نوابی گردانتا اور خاموش کام کی جگہ لاف زنی اور ظاہر داری میں طُغرۂ امتیاز حاصل کرنا ہمارا خاصہ بن چکا تھا، پھر انگریز قوم کو ہم اُستاد کیوں نہ گردانیں کہ جو خصوصیات اور معیار انھوں نے اپنے آزاد اور مائل بہ ترقی معاشرے کے لئے ضروری سمجھا تھا اُس کے بالکل برعکس وہ ہماری قوم کے لئے تجویز فرماتے تھے تاکہ ہم خوابِ خرگوش میں محوِ خرام رہیں اور سُست الوجودی اور لاف زنی ہی کو عین شانِ بلندی سمجھیں۔ قارئین آگاہ ہوں گے کہ خود انگریز قوم خود کس قدر RESERVE یعنی خاموش ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مکمل طور پر بروئے کار لایا ہوا ہے۔ بسوں یا ٹرینوں میں بھی کوئی شخص غیر ضروری طور پر کسی سے بات نہ کرے گا بلکہ سب لوگ انتہائی خاموشی سے اپنے اپنے مفید مطالعہ میں مصروف ہوں گے۔ اسی طرح زندگی کے باقی اوقات میں بھی وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ APPOINTMENT کے بغیر کسی شخص سے ملنا بھی ممکن نہیں ہوتا اور مصروفیت بھی ایسی کہ اُس پر وقت کے ضیاع کا احتمال تک ممکن نہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے جن خصوصیات کی ہماری قوم میں حوصلہ افزائی کی وہ جھوٹی شان یعنی اپنا کام اپنے ہاتھوں سے نہ کرنا۔ RESERVE یعنی خاموش کارکن ہونے کی بجائے BRIGHTNESS یعنی ظاہر داری پر زور دینا۔ خاموش کارکنوں کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی چونکہ انھیں معلوم تھا کہ اگر خاموش کارکنوں کو آگے لایا گیا تو وہ بہت جلد انگریزی استعمار کا بوریا بستر گول کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اگر ہم خلفائے راشدین اور اسلامی دور کے دیگر بلند

وقتوں کو دیکھیں یا کسی بھی قوم کے زریں عہد کو لیں تو یہی اوصاف جن کے باعث انگریزوں نے ترقی کی اور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اُن کی ترقی کا محور نکلیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ محنت، دیانت، عقل و شعور کا پوری طرح استعمال۔ لاف زنی کی بجائے کام پہ زور۔ جھوٹ۔ چوری چکاری اور دیگر دنیاوی آلائشوں سے پرہیز کے باعث اگر یہ کہا جائے کہ آج کل کی ترقی یافتہ قوموں نے اسلام کی روح کو اپنا لیا ہے اور اسلامی اقوام صرف اسلام کے نام کو لے کر بیٹھ رہی ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ انہی اوصاف سے متعلق علامہ اقبالؒ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ متحرک زندگی یعنی جہدِ مسلسل کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم
یہ بھی سُنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

خاموش کارکن کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موڑ ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز — مانندِ برق تیز، مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر — ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس — نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش
مینا مُدام شورشِ قلقل سے پا بہ گِل — لیکن مزاجِ جام خرام آشنا خموش

شاعر کے فکر کو پرِ پروازِ خامُشی
سرمایہ دارِ گرمیٔ آوازِ خامُشی

ٹیگور نے رومانویت کے علاوہ علاقائیت پر زور دیا۔ علامہ اقبال رح نے وطنیت یا علاقائیت سے ماورا ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش کیا۔ اور اسلامیانِ ہند کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لئے علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ شروع میں اُسے شاعر کا خواب کہا گیا جو بالآخر ایک زندہ حقیقت بن گئی۔ آپ نے رومانویت کے فنون آشنا نشے کی بجائے ایک متحرک زندگی اور بامقصد ادب کا سبق پڑھایا۔ انگریزوں کے لئے ٹیگور کی رومانویت اور علاقائیت سودمند تھی لہٰذا اُسے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اقبالؒ کا جاندار فلسفہ ایک خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے زبردست طمانچہ تھا اور ملّتِ اسلامیہ کے احیا کی بھرپور سعی۔ لہٰذا انگریز کو یہ ایک آنکھ نہ بھایا اور انھیں نوبل پرائز سے محروم رکھا گیا لیکن وہ ان استعماری اعزازات سے بے نیاز اپنی جہدِ مسلسل میں ہمہ تن مصروف رہے اور بالآخران کی قوم سرخرو ہوئی۔ ٹیگور کا فلسفہ چونکہ روبہ زوال سوسائٹی کا مظہر تھا لہٰذا پھر ۱۹۷۱ء میں مجیب الرحمٰن کے روپ میں مکمل طور پر ذلیل اور ملیامیٹ ہوا۔ اقبالؒ کی نظم "وطنیت" اسی سیاق و سباق میں ملاحظہ فرمائیے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

جہاں علامہ اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ کی عظمت کے گیت گائے ہیں اور عرب ہندوستان، سپین، ترکی، مصر اور بربر کی شمالی افریقی اسلامی سلطنتوں کی گذشتہ سطوت اور درخشندہ ماضی کی تفصیل بیان کی ہے وہاں انھوں نے مسلم اقوام کی پسماندگی تقدیر پرستی، مُلائیت اور تفرقہ بازی پر اُنھیں طعن و تشنیع کا ہدف بھی بنایا ہے اُنھیں خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے کے لئے اُن کی کمزوریاں اور نالائقیاں واضح طور پر اُن کے گوش گزار کردی ہیں۔ ایک انتہائی بگڑے ہوئے شاگرد کی اصلاحِ احوال کے لئے جس طرح ایک سخت گیر اُستاد بالآخر اُس کی گوشمالی پر اُتر آتا ہے اسی طرح علامہ اقبالؒ نے اس بگڑی ہوئی ملت کی گوشمالی اس طرح کی ہے کہ یہ اُسے صدیوں تک یاد رہے گی

اور اُس کے لئے کافی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں قیامِ پاکستان کے لئے جہاں قائدِ اعظمؒ اور دیگر زعماء کا تدبر اور سیاسی شعور رنگ لایا وہاں علامہ اقبالؒ کی مذکورہ گوشمالی کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ اُن کی شہرۂ آفاق نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ میں اُن کا یہ رنگ اپنے عروج پر ہے۔ شکوہ میں اُنھوں نے آجکل کے مسلمانوں کے اُس غلط استدلال کو پیش کیا ہے جس کا سہارا لے کر وہ اللہ سے خاکم بدہن شکوہ کرتے ہیں کہ کیوں اُن پر اب الطاف و اکرام کی بارش نہیں رہی ؎

اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اللہ کی طرف سے جوابِ شکوہ اقبالؒ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے ؎

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جن میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

بانگِ درا میں جو نظمیں شامل ہیں اُن میں مناظرِ فطرت کی تصویر کشی اور بچوں کے لئے نظموں کی بھی ایک خاصی تعداد شامل ہے۔ ان نظموں کی ایک واضح خصوصیت جو ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جہاں آپ نے تفصیل سے اپنے موضوع کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بیان میں انتہائی لطیف اور شاعرانہ ترکیبیں استعمال کی ہیں اُس کے ساتھ ساتھ وہ جگہ جگہ بنی نوع انسان کی فلاح اور ملتِ اسلامیہ کی بیداری کی سعی میں انتہائی خیال آرا فلسفیانہ مسائل حل کر گئے ہیں۔ یعنی اس میدان میں طبع آزمائی کے وقت بھی انسانی فلاح کا پہلو اُن کے دل و دماغ سے دُور نہیں ہو پاتا اور وہ اس خوبی اور حُسن سے اپنا مدعا بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا طبیعت پر بوجھ محسوس نہیں کر پاتا اور اصلاحِ احوال کا پہلو بھی اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ بچوں کے لئے نظموں میں زبان انتہائی سادہ اور عام فہم ہے کہ ان کے لئے اس میں تفریح اور سبق آموزی کا سامان مکمل طور پر موجود ہوتا ہے۔ اُن کی ایسی نظمیں بچوں کے سلقے میں زبان زدِ عام ہیں۔ مثلاً اُن کی نظم "بچے کی دعا" جس کا پہلا بند ہے ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اسی طرح اُن کی نظم "ہمدردی" بچّے بچّے کی زبان پر ہے اور اس میں کس خوبصورت انداز اور سادہ زبان میں کس قدر ارفع و اعلیٰ پیغام دیا گیا ہے ؂

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اُڑنے چگنے میں دن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مناظرِ فطرت کی نقشہ کشی کے سلسلے میں اُن کی کوئی نظم بھی لے لیجیے، اُس میں تفصیل سے اُس منظر کا بیان بھی ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی اونچے مقصد کی نشاندہی بھی نہایت فلسفیانہ انداز میں اس میں موجود ہو گی۔ ان کی نظم "کنارِ راوی" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے ؂

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرمِ ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی

نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دُور گئی
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھُپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

نظم ابرِ کوہسار سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے ؎

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابرِ کہسار ہوں گل پوش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

"بانگ درا" میں اقبالؒ کی غزلیات کا بھی ایک خاصا مجموعہ شامل ہے لیکن ان میں بھی خالص عشقیہ غزلیں بہت کم ہیں۔ اِن کی طبیعت غزلوں میں بھی فلسفیانہ خیالات اور بلند مقاصد کی نشاندہی میں ہی اپنے عروج پر ہے ؎

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا بتخانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے
سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

الغرض اقبالؒ کے مجموعۂ کلام کا کوئی بھی میدان لے لیجئے چاہے وہ مناظرِ فطرت

کی نقشہ کشی ہو یا بچوں کی نظمیں۔ غزلیات ہوں یا کسی نظریۂ فکر پر کوئی طویل نظم ہم اُن کے خیالات ان کی مختصر سی نظم بعنوان "شاعر" کے مطابق پاتے ہیں ؎

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

حکیمِ مشرق

علامہ اقبالؒ نے اپنا مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھا ہے۔ گوئٹے کو خود اُنھوں نے "حکیمِ حیات" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ گوئٹے کی یہ تصنیف ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو اُس نے مغرب کی طرف سے مشرق کو بھیجی۔ وہ فارسی شعرا اور خاص طور پر حافظِ شیراز سے خصوصیت کے ساتھ متاثر تھا۔ اُس زمانے میں یعنی اُنیسویں صدی کے اوائل میں جرمن قوم کا انحطاط آج کل کی مشرقی اقوام کی طرح اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ حافظ کی مترنم خیال آرائیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ بقول علامہ اقبالؒ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی۔ غرض ہر بات میں اُسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمانِ اسرار ہے اُسی طرح گوئٹے بھی ہے دونوں عام تباہی و بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی سکون و اطمینان کو محفوظ رکھ کر

اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔

"پیامِ مشرق" کے متعلق جو گوئٹے کے "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، علامہ اقبالؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کا مدعا زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ علامہ اقبالؒ دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے اُن میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو۔ اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اقوام کی طبائع پر خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی، وہ فرسودہ، سُست رگ اور زندگی سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔

گوئٹے نے فارسی شاعری کی صرف غزلیت کا اثر قبول کیا ہے۔ اُس کی نگاہ صرف اُنہیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جن کو اُس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔ عجمی تصوف سے اُسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو اُسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار

کی تفسیر تصوف کے نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے۔ وہ خود تغزلِ محض کا دلدادہ تھا اور کلامِ حافظ کی صوفیانہ تعبیر سے اُسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اُس کے نزدیک مبہم تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے رومی کے کلام پر غائرانہ نگاہ نہیں ڈالی کیونکہ مسئلۂ وحدت الوجود کی حمایت میں قلم اُٹھانے کے باوجود عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ رومی کا قائل نہ ہو۔ اپنے اور گوئٹے کا مقابلہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دونوں ضمیرِ کائنات کے واقف ہیں اور موت کے اندر پیغامِ حیات ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ برہنہ خنجر کی مانند ہے اور میں ابھی نیام میں ہوں۔ وہ گوئٹے کی اس خصوصیت سے کچھ شاکی نظر آتے ہیں کہ اُنھوں نے مشرقی شاعری کے صرف ظاہری معنوں کو اپنایا اور جامۂ الفاظ میں پوشیدہ جہانِ معنی کے باطن خزانوں کو ڈھونڈ نہ پایا۔ وہ صرف مشرقی تغزل ہی سے اثر لے سکا اور مشرق کے تصوف۔ اُس کی بیتابیٔ جاں اور اُس کے کمالِ جنوں (جس میں فرزانگی پنہاں ہے) کو نہ پا سکا۔ اُن کے مندرجہ ذیل اشعار ان خیالات کا مرقع پیش کرتے ہیں ؎

ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام اُو برہنہ من ہنوز اندر نیام
آشنائے من ز من بیگانہ رفت از خمستانم تہی پیمانہ رفت
او حدیثِ دلبری خواہد ز من رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت صورتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک دیں بر من کشود نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

تا نہ پنداری سخن دیوانگیست
در کمالِ ایں جنوں فرزانگیست

(ترجمہ: دونوں ضمیرِ کائنات کے جاننے والے ہیں۔ دونوں موت کے اندر حیات کا پیغام ہیں۔ دونوں آئینے کی طرح صبح کی مانند چمکتے ہوئے خنجر ہیں۔ وہ برہنہ ہے اور میں ابھی نیام میں ہوں۔ میرا آشنا مجھ سے بیگانہ چلا گیا اور میرے خمستان سے خالی جام ہی چلا گیا۔ وہ مجھ سے دلبری کی باتیں چاہتا ہے اور مجھ سے شاعری کا رنگ اور چمک مانگتا ہے۔ اس کم نظر نے میری جان کی بیتابی نہ دیکھی اس نے میرا ظاہر دیکھا اور میرا باطن نہ دیکھا۔ میری فطرت نے عشق کو خاک کی صورت پہلو میں لے لیا اور اُسے سلگا دیا یعنی راہِ حق اور راہِ وفا کو اپنایا اور اُنھیں چمکا کر رکھ دیا۔ حق تعالےٰ نے ملک و دیں کے رموز مجھ پر کھولے اور غیر کا نقش میری آنکھ کے پردے سے ہٹا دیا۔ جب تک کہ تو غور نہ کرے میری باتیں دیوانگی معلوم ہوں گی لیکن جنون کے اس کمال میں عقلمندی پوشیدہ ہے)

علامہ اقبالؒ مشرق میں پیدا ہوئے اور اسلامی فضا میں اُنھوں نے آنکھ کھولی اور زندگی بسر کی۔ لازمی طور پر اُنھوں نے اپنے گرد و پیش کے ابتر حالات کو دیکھ کر ہر ممکن طریقے سے اُن میں بہتری کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے مغربی تہذیب کی اندھا دھند MATERIALISM اور انسانی و مذہبی جذبات سے مکمل طور پر معرا پن پر بھی واضح طور پر چوٹیں کر کے اُن کے عیوب کو درست کرنے کی سعی کی ہے لیکن اُنھوں نے مشرقی اور اسلامی دنیا میں رچے بسے عیوب و مضمرات کو EXPOSE یعنی عیاں کر کے اُنھیں دُور کرنے کی طرف بجا طور پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کتاب کے عنوان "پیامِ مشرق"

کے ساتھ ہی "لِلّٰہِ المشرق والمغرب" کے الفاظ استعمال کر کے اُنھوں نے واضح کر دیا ہے کہ مشرق ہو یا مغرب اللہ تعالیٰ ہی کی سرزمین ہے اور یہ کہ وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کی کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ اس طرح اُن کی آفاقیت مکمل طور پر واضح اور عیاں ہے۔ بہر حال چونکہ وہ خود مشرق کی پیداوار تھے، ایک مسلم گھرانے اور مسلم علاقے میں اُنھوں نے جنم لیا اور یہیں کی فضا میں اُنھوں نے زندگی بسر کی لہٰذا یہ لازمی امر تھا کہ وہ مشرقی اقوام اور اسلامی دنیا کی پسماندگی کی نشاندہی کریں اور پسماندگی کے اس پہاڑ کو جو ہماری ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے عبور کرنے کی راہیں نہایت تفصیل سے ہمیں بتائیں اگر وہ ایسا نہ کرتے بلکہ صرف پہلے سے ترقی یافتہ مغرب ہی کی طرف توجہ مبذول کیے رکھتے تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ مشرق اور خصوصاً اسلامی دنیا کی آجکل کی انتہائی پسماندگی کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

ابلہی دروشتِ خویش از راہ رفت — از دم او سوزِ الّا اللہ رفت
مصریاں اُفتادہ در گردابِ نیل — سُست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آلِ عثمان در شکنجِ روزگار — مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ — خود فروشے، دل زِ دیں بر کندۂ
در مسلماں شانِ محبوبی نماند — خالد و فاروق و ایوبی نماند
ملّتِ آوارۂ کوہ و دمن — در رگِ او خونِ شیراں موج زن

تازہ کُن آئینِ صدیق و عمر
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

(ترجمہ: اہل یثرب اپنے ہی صحرا میں راستہ بھول گئے۔ اُس کے سانس سے اِلا اللہ کا سوز ختم ہوگیا۔ مصری لوگ گرداب نیل میں گر گئے۔ ہاتھی ایسے مضبوط تورانی اب سُست رو ہوئے ہوئے ہیں۔ آلِ عثمان زمانے کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مشرق اور مغرب اُس کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہے۔ ہندی مسلم پیٹ کا بندہ ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے اور اُس نے دین سے اپنے دل کو ہٹا دیا ہے۔ مسلمان میں محبوبی شان نہیں رہی۔ اُس میں خالد فاروق اور ایوب کی روح نہیں رہی۔ اے کوہ و دمن کی آوارہ ملت کہ تیری رگوں میں شیروں کا خون موجزن ہے تو صدیقؓ و عمرؓ کے آئین کو تازہ کر اور صبا کی طرح لالۂ صحرا پر سے گذر جا)

ملتِ آوارۂ کوہ و دمن یعنی افغانستان کے فرمانروا کو ترقی کا نسخہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جدّوجہد اور علم ترقی کا زینہ ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے جدید علوم کو یورپ کا سرمایہ سمجھ کر اُن سے اجتناب اور فرار کی راہ اختیار کرلی ہے حالانکہ دراصل یوروپی اقوام نے یہ علوم اسلامی دنیا ہی سے حاصل کئے تھے۔ اسی طرح جدّوجہد کو چھوڑ کر افیون کا نشہ ہم پر طاری ہوگیا ہے جس سے ہم خواب خرگوش کے مزے لیتے رہ گئے۔ علامہ اقبالؒ نے ہمیں مسلسل جدّوجہد کی تلقین کی اور جدید علوم کو اکسیر بتا کر اُنھیں علما اور فضلا کے ذریعے دوبارہ حاصل کرنے پر اُکسایا۔ اس کے ساتھ افغانستان کو اس امر پر مائل کیا کہ اپنی ملکی دولت کو جو پہاڑوں میں پوشیدہ ہے یعنی دھاتوں وغیرہ کو جن کی کمی افغانستان میں کسی طور نہیں، مکمل طور پر دریافت کرکے اُن سے استفادہ کریں تاکہ ملک صحیح معنوں میں ترقی کی جانب گامزن ہوجائے۔ خود اُن کے الفاظ میں سُنئے ؎

زندگی جہد است و استحقاق نیست جُز بعلمِ انفس و آفاق نیست

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ‏ ‏ ‏ ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علمِ اشیا عَلَّمَ الاسما ستے ‏ ‏ ‏ ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
علمِ اشیا داد مغرب را فروغ ‏ ‏ ‏ حکمتِ او ماست می بندد ز دوغ
جانِ ما را لذّتِ احساس نیست ‏ ‏ ‏ خاکِ رہ جُز ریزۂ الماس نیست
علم و دولت نظمِ کارِ ملّت است ‏ ‏ ‏ علم و دولت اعتبارِ ملّت است
آں یکے از سینۂ احرار گیر ‏ ‏ ‏ واں دِگر از سینۂ کُہسار گیر
دشنہ زن در پیکرِ ایں کائنات ‏ ‏ ‏ در شکم دارد گہرُ چوں سومنات

لعلِ ناب اندر بدخشانِ تو ہست
برقِ سینا در قہستانِ تو ہست

(ترجمہ : زندگی کوشش سے ہے اور اس کے بغیر اس پر ہمارا حق نہیں۔ یہ سوائے اس جہاں اور آفاق کے علوم کے اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے جہاں بھی تو اِس نیکی کو دیکھے پکڑ لے۔ اشیا کا علم جہانوں کو تسخیر کرنے والا علم ہے یہ عصائے موسیٰ بھی ہے اور یدِ بیضائے عیسیٰ بھی۔ علم اشیا نے مغرب کو ترقی دی وہ اصل میں ہماری ہی حکمت ہے اور ہمیں سے اُس کی تعمیر ہوئی۔ علم و دولت قوم کے لئے مختلف شعبوں کے نظم و نسق کا باعث بنتا ہے۔ علم و دولت قوم کا اعتبار ہے۔ اُس ایک کو تو مردانِ حُر کے سینے سے لے اور اُس دوسری چیز کو تو پہاڑ کے سینے سے لے۔ اس کائنات کے پیکر میں تو خنجر پیوست کر۔ یہ پیٹ میں سومنات کی طرح لعل و گہر لئے ہوئے ہے۔ تیرے بدخشاں میں لعلِ ناب ہے اور تیرے پہاڑوں میں برقِ سینا موجود ہے) ۔

علامہ اقبال ؒ نے آرزو کو ترقی کا پیش خیمہ بتایا ہے۔ جب کسی اونچے مقام پر پہنچے

کی آرزو ہمارے دل میں پیدا ہوگی، جب ترقی کی منازل طے کرنے کی خواہش ہمارے دماغ میں ہیجان انگیز ہوگی اور جب طاقتور اور دولتمند بننے کی تمنا ہمارے پہلو میں کروٹیں لے گی تبھی ہم اُس مقام کی طرف اپنا سفر شروع کر سکیں گے۔ جب اونچا اُڑنے کی خواہش ہی کو ہم اپنے آپ میں پروان نہ چڑھا سکیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے کبھی کوشش کا خیال ہی پیدا نہ ہوگا اور اُسے حاصل کرنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اپنی اس تصنیف میں علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ آرزو تمنا اور بلند ہمتی کی تلقین کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دریں گلشن پریشاں مثل بُو بم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جُویم
برآید آرزو یا برنیاید — شہیدِ سوز و سازِ آرزُویم

(ترجمہ: میں اس گلشن میں خوشبو کی طرح پریشان ہوں میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس کی تلاش میں ہوں۔ میری آرزو برآئے یا نہ برآئے میں آرزو کی سوز و ساز کا شہید ہوں)

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد — نگاہِ شوق در اُمید و بیم است
نمی گردد کہن افسانۂ طُور — کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

(ترجمہ: عقل نے کہا کہ وہ آنکھ میں نہیں سما سکتی۔ نگاہِ شوق اُمید و بیم کے عالم میں ہے۔ طُور کا افسانہ پُرانا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ہر دل میں کلیم کی تمنا ہے)

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست — با من مَیا کہ مسلکِ شبّیرم آرزوست
از بہرِ آشیانہ خس اندوزیم مگر — بازاں نگر کہ شعلۂ در گیرم آرزوست
گفتند لب بہ بند و ز اسرارِ ما مگو — گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزوست

گفتند ہر چہ در دلت آید زما بخواہ — گفتم کہ بے حجابیِ تقدیرم آرزوست
از روزگارِ خویش ندانم جُز ایں قدر — خوابم زیاد رفتہ و تعبیرم آرزوست
کُو آں نگاہِ ناز کہ اوّل دلم ربود
عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

(ترجمہ: مجھے تیر اور سناں اور خنجر اور شمشیر کی آرزو ہے۔ تو میرے ساتھ نہ آ چونکہ مجھے شبیرؓ کے مسلک کی آرزو ہے۔ تو دیکھ کہ ہم نے اپنے آشیانے کے لئے خس جمع کی اور پھر یہ بھی دیکھ کہ آرزو یہ ہے کہ ہماری بغل میں شعلہ ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ اپنے ہونٹ بند کر لو۔ اور ہمارے اسرار سے متعلق بات نہ کرو۔ میں نے کہا کہ خیر ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ میں نعرۂ تکبیر بلند کردوں۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ تمہارا دل چاہے اس کی خواہش کرو۔ میں نے کہا کہ مجھے تقدیر کی بے حجابی کی خواہش ہے۔ میں اپنے زمانے سے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ میں نے بہت خواب دیکھے ہیں اور مجھے اس کی تعبیر کی ضرورت ہے۔ وہ کونسی نگاہِ ناز تھی جو سب سے پہلے میرا دل چھین کر لے گئی۔ تیری عمر دراز ہو مجھے اُسی تیر کی آرزو ہے)

جہاں یک نغمہ زارِ آرزوئے — بم و زیرش ز تارِ آرزوئے
بچشمم ہر چہ ہست و بود باشد — دمے از روزگارِ آرزوئے

(ترجمہ: یہ دنیا آرزو کا ایک نغمہ زار ہے۔ اُس کے اونچے اور نیچے سُر آرزو کی تار کے باعث ہیں۔ میری آنکھ میں جو کچھ بھی ہے یا تھا یا ہو گا وہ آرزو کے روزگار ہی کا ایک لمحہ ہے)

ندارد کار با دوں ہمتاں عشق — تذروِ مردہ را شاہیں نگیرد

(ترجمہ: عشق پست ہمت لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، شاہین مردہ کبوتر کو قبول نہیں کرتا)

اگر ہمارے دل میں آرزومندی کی ہیجان خیزی ہو، اگر ہم بلند سے بلند تر منزل تک پہنچنے کی آرزو رکھتے ہوں۔ اگر ہم بہتر اور اُس سے بھی بہتر کامیابی حاصل کرنے کے متمنی تو ہوں لیکن اس آرزو، اِس خواہش اور اس تمنا کی تکمیل کے لئے ہم جہدِ مسلسل سے کام نہ لیں تو ہماری یہ آرزو، یہ خواہش اور یہ تمنا شیخ چلی کے خوابوں کے مترادف ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی اِن خواہشات کی تکمیل کے لئے یکسوئی سے اور باقی ہر خیال سے بیگانہ ہو کر انتھک جدوجہد کے ایک لامتناہی سلسلے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ شروع کی ناکامیوں سے ہرگز بددل نہ ہوں۔ چونکہ آخر زندگی تو ہے ہی نشیب و فراز کا نام۔ اِس زندگی میں جہاں کامیابیاں ہمارے قدم چومتی ہیں وہاں ناکامیوں کا سامنا ہونا بھی ضروری اور فطری امر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عظیم فرد اور عظیم قوم وہی ہے جو راستے کی ناکامیوں اور رکاوٹوں سے گھبرا کر جدوجہد کو چھوڑ نہ دے بلکہ اُن ناکامیوں، اُن رکاوٹوں اور راستے کی اُن مشکلات پر قابو پانے کی ترکیبیں سوچے اور بالآخر اپنی زیرکی اور بلند ہمتی سے اپنے راستے کی بڑی سے بڑی رکاوٹ پر قابو پا کر کامیابی کو اپنے آپ سے ہمکنار کرلے۔ علامہ اقبالؒ نے یہی سبق ہمیں نہایت وضاحت سے دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ان کا پیغام ملاحظہ ہو ؎

سکندر با خضر خوش نکتہ را گفت — شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

(ترجمہ: سکندر نے خضر سے کیا اچھی پتے کی بات کہی کہ تو بحر اور بر کے سوز و ساز

کا شریک بن جا۔ تو اس جنگ کو میدانِ کارزار کے کنارے سے دیکھ رہا ہے۔ تو جنگ میں شامل ہو کر ختم ہو جا۔ اور اس طرح پہلے سے زیادہ بھرپور زندگی حاصل کر)۔

مہل افسانۂ آں پا چراغے	حدیثِ سوز او آوازِ گوش است
من آں پروانہ را پروانہ دارم	کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

(ترجمہ: اُس چراغ پا کا افسانہ سُنو۔ اُس کے سوز کی حدیث ہمارے کانوں کی آواز بنی ہوئی ہے۔ میں اُس پروانے کو پروانہ سمجھتا ہوں جس کی جان سخت کوشش کرنے والی اور شعلہ نوش ہے یعنی مصیبتیں برداشت کرنے کی عادی ہے)۔

سحر در شاخسارِ بوستانے	چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری	سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

(ترجمہ: صبح کے وقت ایک باغ کی شاخسار پر ایک نغمہ خواں پرندے نے کیا خوب کہا کہ تو اپنے سینہ میں سرود۔ نالہ۔ آہ یا فغاں جو کچھ بھی رکھتا ہے اُسے باہر نکال)

مہارا بزم بر ساحل کہ آنجا	نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش درآویز	حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(ترجمہ: تو اپنی بزم ساحل پہ آراستہ مت کر چونکہ وہاں زندگی کی لے نرمی پیدا کرتی ہے یعنی زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما نہ ہوتے ہوئے تن آسانی کی زندگی بسر نہ کر۔ تو دریا میں چھلانگ لگا اور اس کی موجوں سے نبرد آزما ہو۔ ہمیشہ کی زندگی جدوجہد میں پوشیدہ ہے)

دل بیباک را ضرغام رنگ است	دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است	اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

(ترجمہ: ایک بیباک دل کے لئے بڑی سے بڑی مشکل آسان ہوتی ہے اور ڈرپوک دل کے لئے ہرن بھی چیتے کی مانند ہوتا ہے۔ اگر تو خوف نہیں رکھتا تو بحر بھی صحرا ہے اور اگر ڈرتا ہے تو اُس کی ہر موج اژدہا ہے)۔

دلِ من راز دانِ جسم و جان است — نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

(ترجمہ: میرا دل جسم اور جان کا رازداں ہے۔ تو یہ نہ سمجھ کہ اجل مجھ پر بھاری ہے۔ کیا غم اگر ایک جہاں میری آنکھ سے اوجھل ہوگیا۔ ابھی میرے ضمیر میں سیکڑوں جہان موجود ہیں)۔

نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش — جسور و غیور و دلاں گیر باش
نگہ دار خود را و خورسند زی — دلیر و درشت و تنومند زی
نصیبِ جہاں آنچہ از خرمی است — ز مسکین و محنت و بُردمی است
چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب — کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعلِ ناب
کنامے نگیریم در باغ و کشت — کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت

ز روئے زمیں دانہ چیدن خطاست
کہ مہمانِ گردوں خدا داد ماست

(ترجمہ: نیک شیوہ اختیار کر اور تدبیر میں پختگی حاصل کر۔ تو جرأت مند، غیور اور اونچا مقصد رکھنے والا بن۔ تو اپنے اوپر نگہ رکھ یعنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا اور مبنی خوشی زندہ رہ۔ دلیر اور درشت اور تنومند بن کر زندہ رہ۔ عقاب نے اپنے بیٹے سے کیا خوب کہا کہ خون کا ایک قطرہ لعل ناب سے بہتر ہے۔ ہم باغ اور کھیت

میں پناہ حاصل نہیں کرتے چونکہ ہم پہاڑ اور صحرا میں ہی اپنی بہشت سمجھتے ہیں، زمین پہ سے دانہ چُننا غلطی ہے چونکہ آسمان کی وسعتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہیں) ۔

یک ذرّۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت
وامانده شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شُد
از سوزِ حیات است کہ کارش ہمہ زر شُد
دارائے نظر شد
پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پُو کرد
بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ اُو کرد
ترکِ من و تُو کرد

(ترجمہ: ایک بے قیمت ذرّے نے اپنی جان کی دولت جلادی ۔ اُس کے شوق نے اُسے اس قدر جلایا کہ اُسے پرواز سکھادی ۔ اُس نے رات کی وسعتوں کو روشن کر دیا ۔ ایک تھکی ہوئی شعاع میں اُلجھن میں تھی اور شرر بن گئی ۔ یہ زندگی کے سوز کی ہی وجہ تھی کہ انجام کار وہ سونا بن گئی اور صاحب نظر بن گئی ۔ وہ بے تاب پروانہ جو ہر طرف تگ و پُو کرتا تھا شمع پہ اس طرح جلا کہ اُس نے اپنے آپ کو مکمل طور پہ اُس میں شامل کر دیا اور میں اور تُو کے قصے کو ہی ختم کر دیا) ۔

غزالے بہ غزالے دردِ دل گفت — ازیں پس در حرم گیرم کُنامے
بصحرا صید بنداں در کمیں اند — بکامے آہواں صبحے نہ شامے

امان از فتنۂ صیاد خواہم
دمے زندیشہ ہا آزاد خواہم
رفیقش گفت اے یارِ خردمند اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فساں زن ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

(ترجمہ، ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے دل کا درد کہا کہ اب سے بعد میں حرم میں پناہ لوں گا۔ صحرا میں شکار کرنے والے کمین لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر فوں کی مرضی کے مطابق نہ تو صبح ہوتی ہے اور نہ شام۔ میں صیاد کے فتنہ سے امان مانگتا ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے میں پریشانیوں سے آزادی چاہتا ہوں۔ اُس کے ساتھی نے کہا کہ اے عقلمند دوست اگر تو زندگی چاہتا ہے تو خطرات کے اندر رہ کر زندہ۔ ہر وقت تو اپنے آپ کو فساں یعنی تلوار کو تیز کرنے والا آلہ بنائے رکھ، پر مار تارہ یعنی اونچے سے اونچا مقصد حاصل کرنے کی کوشش میں جد و جہد مسلسل میں مصروف رہ اور صاف و شفاف تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو کر رہ۔ خطرات تو تاب و تواں یعنی محنتِ شاقہ اور جہدِ مسلسل کے لئے امتحان ہیں اور جسم و جان کی ممکنات کے لئے کسوٹی ہیں)۔

بدقسمتی سے فرنگی نے ہماری قوم میں ایسی عادات و اطوار کی حوصلہ افزائی کی ہے یا فرنگیوں پر ہی کیا الزام دھرنا بدقسمتی سے اب تک خود ہم میں ایسی صفات کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے جو ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً خود انگریز تو ایک RESERVE یعنی خاموش قوم ہے اور یکسوئی سے کسی تعمیری کام میں مشغول

رہنا اس کا خاصّہ ہے۔ لیکن ہماری قوم میں کام کم لیکن BRIGHTNESS یعنی ظاہرداری اور چمکیلے پر زیادہ زور دیا گیا۔ ہمارے ہاں خاموش کارکن کا مذاق اُڑایا جانے لگا اور ظاہرداری میں خصوصی امتیاز حاصل کرنے والے کو اونچا مقام ملنے لگا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نہ خاموش کام کی طرف توجہ ہوئی نہ ہی ترقی کے میدان میں ہم نے حیرت انگیز کارروائی دکھائی۔ صرف ظاہرداری، لباس اور ہرزہ گوئی کے چمکیلے پن ہی میں امتیاز حاصل کیا۔ یہی حال آجکل کی جملہ غیر ترقی یافتہ مشرقی اقوام کا ہے۔ خاموش کام کو چھوڑ کر ظاہرداری ہمارا خاصّہ بن چکی ہے۔ ہم تمغوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کام کے پیچھے نہیں۔ اگر خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہیں تو پانی کی تیز بہتی ہوئی ندی کی طرح بن جائیں جو گرد و پیش سے بیگانہ اپنے کام میں محو اس قدر طاقتور بن جاتی ہے کہ اپنے راستے میں آئے ہوئے صحرا کو کاٹ دیتی ہے اور پہاڑ کے سینے کو چیر ڈالتی ہے۔ اُن کی نظم "جوئے آب" سے اقتباس ملاحظہ ہو ؎

در راہ او بہار پری خانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیگرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود

(ترجمہ: اس کے راستے میں بہار نے پری خانہ پیدا کیا۔ نرگس کھلی، گل لالہ کھلا اور سمن کھلا۔ پھول نے اُسے ناز و عشوے دکھائے اور کہا کہ کچھ دیر میرے پاس ٹھہرو۔ غنچہ ہنسا اور اُس کے دامن کے کنارے کو کھینچا۔ لیکن وہ سبز پوش جلوہ فروشوں

سے ناآشنا رہتے ہوئے (آگے بڑھتا رہا) اُس نے صحرا کو پھاڑا اور پہاڑ کے سینہ کو چیر ڈالا۔ تو وسیع سمندر کی طرح زندہ رہ کہ وہ کس مستی سے رواں رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں مست یعنی اپنے کام میں مگن اور باقی سب سے بیگانہ رواں دواں رہتا ہے)۔

اسی سلسلے میں ایک اور نظم تنہائی میں سے اقتباس سُنئے ؎

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابے　　همیشه در طلب استی چه مشکلے داری؟
هزار لولوئے لالاست در گریبانت　　درونِ سینه چو من گوهر دلے داری
تپید و از لبِ ساحل رمید و هیچ نگفت

ره دراز بریدم ز ماه پرسیدم　　سفر نصیبِ! نصیبِ تو منزلے ست که نیست
جهاں ز پرتوِ تو سیمائے تو سمن زارے　　فروغِ داغِ تو از جلوهٔ دلے ست که نیست
سوئے ستاره رقیبانه دید و هیچ نگفت

(ترجمہ: میں سمندر کے پاس گیا اور اُس کی بیتاب موج سے کہا تو ہمیشہ طلب میں رہتی ہے آخر تجھے کیا مشکل ہے۔ تیرے گریبان میں ہزاروں خالص موتی ہیں اور تو اپنے سینے میں میری طرح ایک دل ایسا گوہر رکھتی ہے۔ وہ تڑپی ساحل سے دور بھاگی اور اُس نے کچھ نہ کہا۔ میں نے ایک لمبا راستہ طے کیا اور چاند سے پوچھا۔ سفر تیرے نصیب میں ہے۔ تیرے نصیب میں کوئی منزل بھی ہے یا نہیں۔ یہ جہاں تیرے عکس اور تیری چاندنی سے سمن زار بنا ہوا ہے۔ تیرے داغ کا فروغ کسی دل کے جلوے کی وجہ سے ہے کہ نہیں ہے۔ اس نے ستارے کی طرف رقیبانہ دیکھا اور کچھ نہ کہا)

ایک پسماندہ قوم یا فرد کے لئے ترقی کا راستہ بہت کٹھن اور دشوار گذار معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ضرورت سے زیادہ سوچ بچار شروع کر دی جائے اور خواہ مخواہ

کے شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں کہ یہ عظیم کام ہمارے محدود وسائل کے بس کی بات نہیں یا وہ بلند مقصود بہ ہماری صلاحیتوں سے بالاتر ہے یا ترقی یافتہ قوموں یا افراد کے مقابلے میں اپنے لئے ہم بلاوجہ احساس کمتری کو روا رکھیں اور عقل و خرد کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہم اپنی راہ میں بے شمار ذہنی رکاوٹیں کھڑی کر لیں تو ظاہر ہے کہ ہم ترقی کے راستے پر گامزن ہی نہ ہو پائیں گے بلکہ اپنی پسماندگی ہی میں ترقی کی بلندی کو اپنے لئے غیر ممکن تصور کرتے ہوئے صدیوں تک جوں کے توں اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم عقل و خرد کے غلط استعمال کے نتیجہ کے طور پر خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا نہ ہونے دیں گے بلکہ عقل و خرد کا صحیح استعمال کرتے ہوئے ایک دلی جذبے سے راستے کی مشکلات کو ہٹاتے ہوئے مستانہ وار اور اپنے بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک جنون کی کیفیت اپنے دل و دماغ میں لئے آگے بڑھیں گے تو ہر قسم کی رکاوٹ پر قابو پاتے جائیں گے اور وہ دن دور نہ ہوگا جب ہم ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بلندی سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ خرد کے غلط استعمال، جو خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے اور دل جذبے اور کام کرنے کے جنون سے متعلق جو ترقی کے راستے کے ہر پتھر کو تنکے کی طرح بہا کر لے جائے۔ علامہ اقبال رحمۃ نے جگہ جگہ نہایت تفصیل سے اپنے مخصوص انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور قوم کو ابھارا ہے کہ اپنی کم مائیگی اور وسائل کی کمی یا موجودہ پسماندگی سے بے حوصلہ نہ ہو بلکہ انتہائی ذوق و شوق اور دلی جذبے سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اس سلسلے میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا کر کے ہر عظیم سے عظیم ترقیاتی منصوبے کی تکمیل کے پیچھے پڑ جائے۔ کامیابی اُس کے قدم چومے گی۔ ملاحظہ ہو ؎

تہی از ہاؤ وہو میخانہ بُودے گِل ما از شرر بیگانہ بُودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق اگر دل چُوں خرد فرزانہ بُودے

(ترجمہ: میخانہ شور و شغب سے خالی ہوتا، ہماری مٹی چنگاری سے بیگانہ ہوتی، یہ عشق اور اس کا ہنگامہ نہ ہوتا اگر دل عقل کی مانند عقل و شعور کا مالک ہوتا۔)

چوں نرگس ایں چمن نادیدہ مگذر چوں بُو در غنچۂ پیچیدہ مگذر
ترا حق دیدۂ روشن ترے داد خرد بیدار و دل خوابیدہ مگذر

(ترجمہ: نرگس کی طرح تو اس چمن کو بغیر دیکھے نہ گذر۔ خوشبو کی طرح پیچیدہ غنچے میں سے مت گذر۔ حق تعالیٰ نے تجھے بہت روشن آنکھیں دی ہیں تو ایسے نہ گزر کہ عقل تو بیدار ہو لیکن دل سویا ہوا ہو)۔

سوزِ سخن ز نالہ مستانۂ دل است ایں شمع را فروغ ز پروانۂ دل است
مشتِ گلیم و ذوقِ فغانے نداشتیم غوغائے ما ز گردشِ پیمانۂ دل است
غافل ترے ز مردِ مسلماں ندیدہ ام دل در میان سینہ و بیگانۂ دل است

(ترجمہ: سخن گستری کا سوز دل کے مستانہ نالے کی وجہ سے ہے۔ اس شمع کو فروغ دل کے پروانے کی وجہ سے ہے۔ ہم ایک مٹھی بھر مٹی اور فغاں کا ذوق نہ رکھتے تھے۔ ہمارا غوغا پیمانہ دل کی گردش کی وجہ سے ہے۔ میں نے کوئی بھی شخص مردِ مسلمان سے زیادہ غافل نہیں دیکھا۔ اگرچہ اُس کے سینے میں دل ہے لیکن وہ دل سے بیگانہ ہے)

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دِگر است آں کہ بُرد دانۂ افتادہ ز خاک

آں کہ گیر و خورش از دانۂ پروین دگر است
دگر است آں کہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آں کہ در شد نہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آنسوئے روپردہ کشادن نظرے
ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است
اے خوشا عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست
ما زِ خلوت کدۂ عشق بروں تاختہ ایم
خاکِ پارا صفتِ آئینہ پرداختہ ایم
در نگرِ ہمتِ ما را کہ بہ دارے نگنیم
دو جہاں را کہ نہاں بُردہ عیاں باختہ ایم
پیشِ ما می گذرد سلسلۂ شام و سحر
بر لبِ جوئے رواں خیمہ بر افروختہ ایم
در دلِ ما کہ بریں دیرِ کہن شب خوں ریخت
آتشے بود کہ خشک و تر انداختہ ایم
شعلہ بودیم، شکستیم و شرر گردیدیم
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

(ترجمہ: عقلِ خود ہیں اور چیز ہے اور عقلِ جہاں ہیں اور چیز ہے۔ بلبل کا پر اور چیز ہے اور شاہین اور باز دار اور چیز ہے۔ وہ اور ہے جو خاک پر سے گرے ہوئے دانے

کو اُٹھاتا ہے اور جو اوجِ ثریا سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے اور ہے۔ وہ جو کہ نسیم کی طرح چمن کی سیر کرتا ہے اور ہے۔ اور جو گل و نسرین کے ضمیر میں داخل نہیں ہوتا اور ہے۔ تو پردوں کے اُس پار تیز نظر سے دیکھ لینا اور بات ہے۔ پردہ کے اس طرف گمان اور ظن اور تخمین اور چیز ہے۔ کیا اچھی ہے وہ عقل کہ دونوں جہانوں کی وسعتیں اسی سے ہیں۔ چمکتا ہوا نور اور آدمی کے دل کا سوز اسی سے ہے۔

ہم عشق کے خلوت کدہ سے باہر نکل آئے ہیں اور پاؤں کی خاک کو ہم نے آئینے کی طرح جلادی ہے۔ تو ہماری ہمت کو دیکھ ہم دونوں جہانوں پر کمند پھینکتے ہیں اور ہر پوشیدہ چیز کو عیاں کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس شام و سحر کا سلسلہ گزر رہا ہے۔ ہم نے رواں دواں ندی کے کنارے خیمہ لگایا ہوا ہے۔ ہمارے دل میں جس نے کہ اس پرانے دیر پر شب خوں ڈالا ہوا ہے کوئی ایسی آگ بھی تھی جس میں ہم نے ہر خشک و تر چیز ڈالی ہوئی تھی۔ ہم ایک شعلہ تھے۔ ہم ٹوٹ گئے اور چنگاری بن گئے۔ ہم ذوق، تمنا اور نظر کے مالک بن گئے)۔

اقبالؒ اور اقوامِ مشرق

آدمیت کی فلاح ہر عظیم شاعر اور ادیب کا، بلا تخصیصِ زمان و مکاں، ہمیشہ مطمحِ نظر رہا ہے۔ مردم بیزار لوگ نہ سوسائٹی میں پسندیدہ گنے جاتے ہیں اور نہ ہی مردم بیزار ادیب یا شاعر ادبی حلقوں میں اونچے مرتبے کے حقدار سمجھے جا سکتے ہیں۔ تفریح میں بھی آدمیت کی فلاح موجود ہے۔ دن بھر بلکہ ہفتوں اور مہینوں کا تھکا ماندہ انسان اگر تفریحِ طبع کے لئے کوئی پکچر یا ڈرامہ دیکھے، یا کوئی ناول یا نظموں کا مجموعہ پڑھے اور اُس میں تفریح کا پہلو اُسے نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ بوریت محسوس کرنے لگے گا۔ لیکن ادیب، شاعر، آرٹسٹ، یا ڈرامہ نگار کا کمال یہی ہے کہ وہ لوگوں کی تفریح کا سامان بھی مہیا کرے اور اُس کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا تجزیہ بھی ہمارے سامنے اس انداز سے پیش کر دے کہ ہم خوابِ غفلت کو چھوڑ کر بیدار مغزی اختیار کر لیں۔

آدمیت کی فلاح میں یوں تو روئے زمین کی جملہ آدمیت آجاتی ہے لیکن ظاہر ہے

کہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ہر شاعر و ادیب بہ نسبت دوسرے علاقوں اور معاشروں کے بہت زیادہ گہری نظر سے دیکھے گا۔ اپنا ماحول، اپنا معاشرہ، اپنا ملک اور اپنا خطہ ہی ہر شاعر و ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتا ہے۔ اپنے معاشرے اور اپنے خطے کی خرابیوں کو درست کرنے کی طرف ہی سب سے پہلے اُسے اپنی توجہ منعطف کرنی ہے۔ پھر اُسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ حقدار کون ہے اور اُس کا حق کس نے چھینا۔ اگر کوئی پسماندہ ہے تو اُس کی وجہ کیا ہے اور اس پسماندگی کا علاج کیا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب ایک بیمار معاشرے کے لئے ایک معالج یا طبیب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی بیماری کی تشخیص اور اُس کے لئے مناسب علاج کا بندوبست اُس کا کام ہے۔

بعض مغربی نقاد اقبالؒ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے صرف اقوامِ مشرق اور ملتِ اسلامیہ پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور صرف انہی کی فلاح کے درپے رہے۔ اُنھوں نے باقی آدمیت یعنی HUMANITY کو کیوں بھلا دیا۔ اُن کے خیال میں اس لحاظ سے علامہ اقبالؒ کے کلام میں UNIVERSALITY یعنی آفاقیت موجود نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ مشرق میں پیدا ہونے اور بدقسمتی سے اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب مشرق اور ممالکِ اسلامیہ اقوامِ افرنگ کے سحر و فریب کے باعث غلامی اور پستی کی انتہاہ گہرائیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یورپ نے انتہائی بے دردی سے اُنھیں لوٹ کھسوٹ کر کفن چوروں کے انتہائی ذلت آمیز کردار کا ثبوت دیا تھا۔ اُن کے مال و دولت کی بجائے اُنھیں مغرب کی زیبائش کے سامان سے نواز کر اُن پر "احسان" کیا ہوا تھا۔ اُنھیں غلامی میں رکھ کر اُنھیں سجدے کی اجازت دے کر فراعنہ کی انتہا کر رکھی تھی۔ ایسے میں علامہ اقبالؒ کی ذمہ داری مشرق اور ممالکِ اسلامیہ تھے یا

اپنے آقاؤں کے قصیدے گانا اُن کا فرض تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبال کے کلام کا سقم نہیں بلکہ اُن کی انتہائی عظمت تھی کہ اُنھوں نے اپنے جابر آقاؤں کے خلاف اور قاہر استعمار پسندوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور واضح الفاظ میں ان کا پول کھولا اور اقوام مشرق کو اُن کی غلامی کا پھندا اُتار پھینکنے پر اُکسایا۔ ان کا کلام پڑھ کر اور اُن کے زمانے یعنی واقعۂ جلیانوالہ کو یاد کر کے قارئین عش عش کر اُٹھتے ہیں کہ ہے کوئی جہاد جو اس سے بڑھ کر ہو۔ اور ہے کوئی بے خوفی اور بلند ہمتی جو اس کی ہم پلہ ہو سکے۔ آفاقیت کا مطلب تو ہرگز نہیں کہ جتنی حمایت مظلوم کی کی جائے اُتنی ہی تعریف ظالم کی بھی کر دی جائے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دینا ہی ایک منصف کا فرض ہوتا ہے اور اس طرح مظلوم کو ظالم کے پنجے سے رہا کرانے کی سعی کرنا شاعر و ادیب کے عظیم مقاصد میں سے ہے۔

اُن کی کتاب "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" صحیح معنوں میں فرنگی استعمال اور غیر ملکی استعمار کے خلاف ایک جہاد ہے ایک طرف تو اُنھوں نے مشرقی اقوام کو یہ بتا کر اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا ماضی عظیم الشان روایات کا حامل ہے اور یہ کہ اگر اب وہ پستی کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں تو ایک زمانہ وہ تھا کہ عظمت اُن کے قدم چومتی تھی اور وہ ایشیا، یورپ اور افریقہ پر مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جدید علوم اور حکمت یورپی اقوام کی میراث نہیں بلکہ اُن کی اصل مسلمانوں ہی سے ہوئی اور اُنھوں نے ان علوم و فنون کو ترقی کی منازل تک پہنچایا اب اگر یورپ نے اُنہی علوم و فنون کو اپنا کر اپنے اپنے ملک و قوم کو چار چاند لگا دیئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اس میدان میں اپنا سکہ نہیں جما سکتے یا یہ کہ ہمیں ان علوم و فنون سے پرہیز کرنا چاہیئے چونکہ خدانخواستہ یہ فرنگی الاصل ہیں یا ہمارے مذہب

کی کسی طرح نفی کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی یہ میراث تو یورپی اقوام سے واپس لے لینی چاہیئے البتہ اُن کے لادین معاشرے اور بے اصول لوٹ کھسوٹ سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اس طرح ایک عظیم عالمی برادری کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں فرماتے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برّۂ — ہر زماں اندر کمینِ برّۂ
مشکلاتِ حضرتِ انساں از دست — آدمیت را غمِ پنہاں از دست
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال — برّہ را کرد است بر گرگاں حلال
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد — از کفن دزداں چہ اُمید کُشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن — صیدِ تو ایں میش و آں نخچیرِ من

(ترجمہ: انسانیت یورپ کے ہاتھوں آہ و بکا کر رہی ہے اور یورپ کی وجہ سے اس دُنیا میں ہزاروں فساد برپا ہیں۔ یورپ اپنی ہی شمشیر سے گھائل ہو کر گر پڑا ہے۔ اور اُس نے اس جہان میں لا مذہبیت کی رسم کو رواج دیا ہے۔ یورپ ایک بھیڑیئے کی مانند ہے جو بھیڑ کی کھال میں پوشیدہ ہو اور جو ہر وقت بھیڑوں کی گھات میں لگا رہتا ہو۔ حضرتِ انسان کی مشکلیں یورپ ہی کی وجہ سے ہیں اور انسانیت کی تکالیف اسی کے باعث ہیں۔ فرنگیوں کا وطیرہ یہ ہے کہ ان کے کندھے پر تلوار عریاں رہتی ہے اور وہ ہر وقت انسانوں کے قتل کے درپے رہتے ہیں۔ یورپ نے شرعاً بے حیل و حجت بھیڑوں کو بھیڑیوں پر حلال قرار دے دیا ہے۔ اس دنیا میں نئے انداز کی بنیاد رکھی جانی لازمی ہے۔ کفن چوروں

سے ہمیں کیا نجات کی امید ہو سکتی ہے۔ جنیوا میں (جہاں لیگ آف نیشنز کا ہیڈ کوارٹر تھا) سوائے مکر و فن کے اور کیا ہے۔ وہاں یہی کچھ ہوتا ہے کہ استعماری طاقتیں اپنے شکار کی بندر بانٹ کر لیتی ہیں)۔

علامہ اقبالؒ مشرق کی گذشتہ روایات کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ہم ہنر ہم دیں زخاکِ خاور است — رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است
دانمودیم آنچہ بود اندر حجاب — آفتاب از ما و ما از آفتاب
ہر صدف از گوہرِ نیسانِ ماست — شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود — زد نخستیں زخمہ از تارِ وجود
اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدِ بیضا برآر از آستیں

(ترجمہ: ہنر اور مذہب دونوں مشرق کا سرمایہ ہیں۔ مشرق کی پاک سرزمین آسمان کے لئے باعثِ رشک ہے۔ ہم نے ہر پوشیدہ ہنر اور قدرتی راز کو پالیا۔ سورج ہماری مانند ہے اور ہم سورج کی مانند ہیں۔ ہر انمول موتی کی ابتدا ہماری وجہ سے ہے۔ اور ہر سمندر کی شان و شوکت ہمارے ہی طوفان کے باعث ہے۔ ہماری بلندیٔ فکر نے اس جہان کے اسرار و رموز کو پالیا اور ہستی کے تار پر پہلی ضرب ہمیں نے لگائی (یعنی علم و حکمت اور ترقی کے میدان میں سب سے پہلے ہمیں آگے بڑھے) اے تہذیب اور مذہب کی دولت کے امانت دار! اسی روشن ہاتھ کو پھر آستین سے باہر نکال)۔

ان حالات و واقعات کو پیش کرنے کے بعد وہ اقوامِ مشرق کو فرنگیوں کی غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کی تلقین کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ماہرانہ گُر انھیں بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

خود بدانی بادشاہی قاہری است — قاہری در عصر ما سوداگری است
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج — از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہانبانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گر تو می دانی حسابش را درست — از حریرش نرم تر کرباسِ تست
بوریائے خود بہ قالینش مدہ — بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ
گوہرش تف دارہ در لعلش رگ است — مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است
رہزنِ چشمِ تو خوابِ مخملش — رہزنِ تو رنگ و آب و مخملش
ہوشمندے از خمِ اُو مے نخورد — ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم فروش — ما چو طفلانیم و اُو شکر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری ست — یارب ایں سحر است یا سوداگری ست
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود — ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر — آں فروش و آں بپوش و آں بخور

(ترجمہ: تو خود جانتا ہے کہ بادشاہی قاہری ہے اور ہمارے زمانے میں استعمار اور قاہری، سوداگری کے راستے سے آئی ہے۔ سوداگر تخت و تاج کا شریک بن گیا اور اس نے تجارت کے ذریعے منافع کمایا اور بادشاہت کے ذریعے خراج حاصل کیا۔ اُس دنیا بھر کو زیرِ نگیں لانے والے سوداگر کی زبان پر خیر کی باتیں ہیں لیکن اُس کے دل میں بدی ہے۔ اگر تو اُس کے حساب کو درست سمجھتا ہے تو اپنے ٹاٹ کو اُس کے مخمل سے نرم اور زیادہ آرام دہ سمجھ۔ اُس کے مال و متاع سے بے نیاز ہو کر گذر جا اور سردیوں میں اُس کی پوستین کو نہ خرید۔ اپنے بوریئے کی بجائے اُس کا قالین مت لے۔ اپنے پیادے

کی بجائے اُس کا دریوزہ حاصل مت کر۔ اُس کا گوہر ناقص ہے اور اس کا لعل عیب دار ہے۔ اِس سوداگر کی مُشک کتے کی ناف سے حاصل کردہ ہے اور اس مخملیں بستر پہ سونے کی خواہش نے تجھے اندھا کر دیا ہے اور اس کی مخمل کی چمک دمک نے تجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کسی ہوشمند انسان نے اس کے میخانہ سے شراب نہیں پی اور جس نے پی وہ اسی میخانہ میں مرگیا۔ رنگ و بو کے تاجر سب منافع اکٹھا کر کے لے گئے اور ہم خریدار تو سب کے سب اندھے اور احمق ہیں۔ اے آزاد مرد جو کچھ تیری خاک سے پیدا ہوتا ہے تو اُسے ہی بیچ " اسے ہی پہن اور اُسے ہی کھا)۔

انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا ایک اہم طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ مشرقی اقوام کو خالصتہً زرعی علاقے بنا کر رکھا گیا تاکہ وہ خام مال پیدا کرتی جائیں۔ صنعتی ترقی انھیں ہرگز نہ کرنے دی گئی۔ اس کے برعکس جملہ صنعتیں انگلستان میں لگائی گئیں۔ یہاں تک کہ ایسی صنعتیں بھی جن کا خام مال مشرقی اقوام سے مہیا ہوتا رہا۔ خود یہاں کی ضروریات کے لئے بھی اُس خام مال سے یہاں مصنوعات تیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ خام مال یہاں سے انگلستان جاتا، وہاں اُن سے اُلٹے سیدھے طریقے پر مصنوعات تیار ہوتیں اور پھر وہی مصنوعات مشرقی اقوام کی وسیع منڈی میں فروخت ہوتیں اور جملہ بے اندازہ منافع یوروپی اقوام کی جیب میں جاتا۔ علامہ اقبالؒ نے مشرقی اقوام کو اس لوٹ کھسوٹ کی طرف متوجہ کیا اور انھیں اپنے استحصال سے نجات حاصل کرنے کی طرف پکارا۔ فرماتے ہیں[۵]

اے زکارِ عصرِ حاضر بے خبر　　　چرب دستیہائے یورپ را نگر

قالی از ابریشمِ تو ساختند　　　باز او را پیشِ تو انداختند

(ترجمہ: اے کہ تو زمانۂ حال کی کارگذاریوں سے ناواقف ہے تجھے چاہیئے

کو یورپ کی چالاکیوں کو پہچانے۔ اُنھوں نے تیری ہی اُون سے قالین بنایا اور پھر اُسے تیرے ہی پاس بے بہا منافع پر فروخت کر دیا)۔

یورپ کی تہذیب میں ظاہری ٹیپ ٹاپ کی فراوانی ہے۔ چہرے کی سُرخی مصنوعی ہے جو یا تو سُرخی پاوڈر کی وجہ سے ہے یا ناؤ نوش کی وجہ سے ہے حقیقی طور پر اُن میں صحت ہے اور نہ بدن کی پاکیزگی اور صفائی۔ یوں تو ہفتہ ہفتہ بھر نہ نہانا اُن کے لئے عین شان بلندی ہے لیکن جسم اور چہرے پر عطر، غازہ کی بھرمار ہوگی تاکہ ظاہری نمائش و دنیا پرستی میں اُن کے جسم کی نجاست اور روح کی پستی بہر حال چھپی رہے۔ اس ظاہری آب تاب سے دھوکہ کھا کر اندھا دُھند طریقے پر مغربی تہذیب کی نقل کرنا کسی کی عقلمندی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ مشرقی اقوام اپنی قدر و قیمت کو پہچانیں اور محنت اور جہد مسلسل سے اپنی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

چشم تو از ظاہرش افسون خورد رنگ و آب اُو تُرا از جان بُرد

وائے آں دریا کہ موجش کم تپید گوہر خود را ز غواصاں خرید

(ترجمہ: تیری آنکھ اُس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمود و نمائش سے دھوکہ کھا جاتی ہے۔ اُس کا رنگ اور چمک دمک، تیرے ہوش و حواس کھو دیتی ہے۔ افسوس ہے اُس دریا پر جس کی موج میں تپش کم ہے اور جس نے اپنے ہی موتی کو غوطہ خوروں سے خرید کیا۔

مشرقی اقوام کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے ایک نکتہ یہی سمجھایا کہ اُن کے دل میں اونچے مقام تک پہنچنے کی آرزو کو خیالی پلاؤ پکانے تک ہی محدود نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُسے حاصل کرنے کے لئے صحیح منصوبہ بندی اور محنت شاقہ کی

ضرورت ہے۔ آرزو کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت پر بھروسہ ہو تو وہ دن دُور نہیں کہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ اپنی نظم "خطاب بہ اقوامِ سرحد" میں فرماتے ہیں ؎

زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس
چشم و گوش و ہوش تیز از آرزو — مشتِ خاکے لالہ خیز از آرزو
ہر کہ تخمِ آرزو در دل نہ کشت — پائمالِ دیگراں چوں سنگ و خشت
آرزو سرمایۂ سلطان و میر — آرزو جامِ جہاں بینِ فقیر
آب و گل را آرزو آدم کند — آرزو ما را ز خود محرم کند
تو خودی اندر بدی تعمیر کن — مشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن

(ترجمہ: زندگی کی بنیاد آرزو پر ہے۔ تو اپنے آپ کو آرزو سے پہچان۔ آنکھیں، کان اور ہوش، آرزو کے باعث تیز تر ہو جاتے ہیں اور مٹھی بھر آرزو ہی کے زور پر گِل لالہ پیدا کرتی ہے۔ جس کسی نے آرزو کا بیج اپنے دل میں نہ بویا وہ پتھر اور اینٹ کی طرح دوسروں کے ہاتھوں پائمال ہی ہوتا رہا۔ آرزو سلطان اور میر کا سرمایہ ہے اور آرزو فقیر کا جامِ جہاں نما ہے۔ آرزو۔ مٹی اور پانی کو آدمی بنا دیتی ہے اور آرزو ہی ہمیں اپنے آپ کی واقفِ حال بنا دیتی ہے۔ تو بُرے وقتوں میں تعمیرِ خودی کر اور اپنی مٹھی بھر مٹی کو اکسیر بنا دے۔)

ہندوستان سے اسلامی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد اور اسی طرح عرب و ترکی کے عہدِ عروج کے خاتمہ کے بعد مشرقی اقوام میں یہ خیال عام گھر کر گیا تھا کہ جدید علوم یعنی سائنس، ٹیکنالوجی۔ اقتصادیات وغیرہ شاید یورپی علوم ہیں جن سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیئے۔ اِس پالیسی پر کافی عرصہ عمل پیرا رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی اقوام

زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے اور یورپی اقوام نے ان علوم کو اپنا کر ہم سے اپنا لوہا منوایا۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی ممالک پر یہ بات واضح کی کہ جدید علوم کی ابتدا عربوں اور اسلامی ملکوں اور تہذیب ہی سے ہوئی۔ اسلام کے عروج کے زمانہ میں یوروپی اقوام تو جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس مسلمان ملکوں نے علوم و فنون اور سائنس و اقتصادیات اور دیگر اقسامِ دانش میں اس قدر ترقی کی کہ مختلف شعبوں میں اب تک اُن کا لوہا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تلقین فرماتے ہیں کہ ان علوم کی اصل چونکہ ہمیں سے ہے اس لئے ان سے پرہیز کرنے کی بجائے انھیں اپنانا چاہیئے۔ مغربی تہذیب سے تو ہمیں بچنا چاہیئے جس میں بے حیائی اور عریانیت اپنے عروج پر ہوتی ہے لیکن ہمیں جدید علوم و فنون کو ضرور اپنا کر اُن کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرنی چاہئیں۔ اپنی نظم "خطاب بہ پادشاہِ اسلام اعلیحضرت ظاہر شاہ" میں فرماتے ہیں ؎

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق — ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال — مومناں را آں جمال است ایں جلال
حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست — اصل اُو جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی تو مسلماں زادہ است — ایں گہر از دستِ ما اُفتادہ است
چوں عرب اندر رُو پا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند

(ترجمہ: ہمارا سرمایہ کتاب و حکمت ہے۔ یہ دونوں قوتیں قوم کا وقار ہیں۔ وہ ذوق و شوق کے جہان کی فتوحات ہیں۔ دونوں خدائے لایزال کے انعام ہیں۔ مومنوں

کے لئے وہ جمال ہے اور یہ جلال۔ اس جہان کی حکمتیں یورپینوں کی پیدا کردہ نہیں۔ اُس کی اصل سوائے ایجاد کی لذت کے اور کچھ نہیں۔ اگر تو غور سے دیکھے تو یہ حکمتیں مسلمانوں ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ موتی ہمارے ہاتھ ہی سے گرا ہوا ہے۔ جب عرب نے یورپ میں پَر پھیلائے تو علم و حکمت کی ایک دوسری ہی بنیاد رکھی۔ دانہ تو اُن صحرانشینوں نے بویا لیکن اس کا حاصل فرنگیوں نے برداشت کیا۔

جس قوم کے مرد و زن بے حیائی۔ بے شرمی اور ظاہری زیبائش کے سوا کسی چیز سے متعلق سوچنے سے عاری ہوں، جس کے امرا اور جس کے علما ہوں اُس قوم کے مردہ ہونے میں اور کون سی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایسی ہی علامات پیش کرتے ہوئے ایک رُو بزوال سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے اور مشرقی اقوام کو اِن مذموم حالات سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھنے کا درس دیا ہے۔ اپنی نظم "حکمتِ فرعونی" میں فرماتے ہیں:

حکمتِ ارباب کیں مکر است و فن — مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات — مردہ زایند از بطونِ اُمہات
دخترانِ اُو بزلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خود نما و خورہ گیر
منعمانِ او بخیل و عیش دوست — غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست
از حدِ امروزِ خود بیروں نجست — روزگارش نقشِ یک فردا نبست
از میاگاں دفترے اندر بغل — الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
دینِ اُو عہدِ وفا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر
آہ قدمے دل زِ من پرداختہ — مردہ مرگِ خویش را نشناختہ

(ترجمہ: اہلِ کینہ کی حکمت مکروفن ہے۔ مکروفن کیا ہے؟ یہ جان کی تخریب اور جسم کی تعمیر ہے۔ بڑے بوڑھے بھی حیا سے بیگانہ ہیں اور نوجوان عورتوں کی طرح اپنے جسم سنوارنے میں مشغول ہیں۔ اُن کے دلوں کی آرزوئیں بے ثبات ہیں۔ وہ اپنی ماؤں کے پیٹوں سے مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی لڑکیاں (یعنی رو بزوال سوسائٹی کی لڑکیاں) اپنی ہی زلف کی اسیر ہوتی ہیں۔ شوخ چشم، خودنما اور پست ہمت ہوتی ہیں۔ اُس قوم کے امرا بخیل اور عیش پرست ہوتے ہیں۔ اپنے عقل وشعور سے غافل ہوتے ہیں اور اپنی کھال میں مست ہوتے ہیں۔ وہ آج کی حد سے باہر جست نہیں لگاتے اور کسی کل کی تعمیر نہیں کرتے اُن کا کہا بالکل بے عمل ہوتا ہے۔ اُن کا دین بے وفائی ہے یعنی حرم کی اینٹوں سے بُت خانہ کی تعمیر اُن کا آئین ہے۔ اُن کا قدم حق کے راستے سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ قوم خود مُردہ ہو چکی ہے لیکن اپنی موت کو کبھی نہیں پہچانتی۔

عالمِ شرق و غرب — اقبالؒ کی نظر میں

علامہ اقبالؒ نے اپنی اُردو زبان کی تصنیف "ضربِ کلیم" میں عالمِ شرق و غرب کی سیاسیات، تہذیب اور سرگرمیوں کا علیٰحدہ علیحدہ بنظرِ غائر جائزہ لیا ہے۔ اُنھوں نے واضح طور پر مشرقین (مشرق و مغرب) میں بسنے والی انسانیت کو گھن کی طرح کھا جانے والے عیوب کا بار بار تذکرہ کیا ہے اور انتہائی مصمم ارادے سے اُنھیں دُور کرنے کے لئے اعلانِ جنگ کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خود اپنے کلام میں مسلسل اِس امر پر زور دیا ہے کہ اگر کوئی عظیم تعمیری مقصد پیشِ نظر ہو تو اُس کے حصول کے لئے صرف خرد کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا کردہ شکوک و شبہات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک انتہائی دلی جذبے کے ساتھ، جسے انھوں نے جنون کا نام دیا ہے، کام کرنا چاہیئے۔ یقینی امر ہے کہ کامیابی اُن کے قدم چومے گی۔ بلکہ یہی اُصول اُنھوں نے دورِ حاضر کے مہلک عیوب کو دور کرنے کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بنظرِ غائر حالات کا جائزہ

لیتے ہوئے مشرق اور مغرب کے رستے ہوئے ناسوروں کی نشاندہی کی ہے اور پھر اصلاح کے ایک شدید ولی جذبے کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ جنگ صاف طور پر ان کے کلام سے واضح ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اقبالؒ کا یقین محکم رنگ لائے اور اُن کا جہاد مشرق و مغرب میں خصوصاً مشرق میں، جہاں اُنھوں نے خود جنم لیا اور ایسے دور میں جنم لیا جب وہ پستی کے انتہائی عمیق غار میں پہنچ چکا تھا، ایک انقلاب پیدا کر دے اور وہ اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے ؎

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات — خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا — قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید — وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلبِ نظر کی رنجوری

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں بار بار نہایت ہی پُرسوز اور درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ ترقی کیسے کریں جب اُن میں نہ تو کردار و عمل کی شدت ہے اور نہ ہی افکارِ عمیق کی فراوانی۔ محکومی۔ فرنگ کی اندھا دھند تقلید اور تحقیق و جستجو کی حس کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے ان کی ذہنیت اس قدر پست ہو چکی ہے کہ وہ خود تو بدلتے نہیں البتہ قرآن کو بدلنے کے لئے اپنی اپنی تاویلیں پیش کرتے ہیں تاکہ غلامی کا جواز پیدا ہو سکے ؎

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ! محکومی و تقلید و زوال و تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

یورپ نے اپنے دورِ عروج میں ملوکیت اور استعمار پرستی کی جس مذموم ذہنیت کا اظہار کیا اور جس بے اصولی طریقے پر آزاد قوموں کی لوٹ کھسوٹ کر کے بندر بانٹ کی اور پھر وہاں کے عوام کا جس طریقے پر استحصال کیا، اُس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور نہایت بے خوفی سے فرنگی بھیڑیوں کی ذہنیت کا بھانڈا پھوڑا ہے ؎

مسولینی

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟ بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج
آلِ سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے اور تم، دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھتی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

فلسطینی عربوں کے خلاف فرنگیوں اور یہودیوں کی سازشوں کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ اگرچہ ان کی بہادرانہ جرات قابلِ قدر ہے لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہودیوں کی پشت پر تمام عالمِ فرنگ ہے چونکہ یہودیوں نے انھیں مالی شکنجے میں جکڑا ہوا

ہے۔ انھوں نے فلسطینیوں کو راہِ نجات بتاتے ہوئے انھیں اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے اور نہایت خود اعتمادی سے ہر محاذ پر ان کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی ہے ؎

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

۱۹۳۵ء میں اٹلی نے افریقہ کے واحد عیسائی ملک حبشہ پر حملہ کر کے اُس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس پر چڑھائی کی نہ کوئی وجہ جواز تھی اور نہ ہی کوئی ایسی اشد ضرورت جس کی بنا پر اس غاصبانہ قبضے کی حمایت کی جا سکتی۔ بس یورپ کے بھیڑیوں کو اپنی استعمار پسندی کے جوہر دکھانے تھے اور اپنی سلطنت کو وسعت بخشنی تھی چنانچہ ایک کمزور اور مرنجاں مرنج افریقی ملک کو نہایت بے رحمی سے اپنے خونیں شکنجے میں جکڑ لیا۔ حالانکہ وہ خود بھی ایک عیسائی ملک تھا۔ گویا ملوکیت، مذہب، نسل یا اصول و ضوابط ہر قسم کے خیال سے مبرا ہے ؎

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ فاش فاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
رومانے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا یہ حقیقت ہے دلخراش

ادب اور فنونِ لطیفہ سے متعلق علامہ اقبالؒ کے خیالات بڑے تعمیری ہیں۔ اُن کی نظر میں فطرت کی محض عکاسی کر دینا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصلاحی پہلو

ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔ اُسے محض فطرت کا پابند ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ فطرت کو مسخر کرنے کے وسائل کی نشاندہی بھی کرنی چاہئے تاکہ انسانی زندگی میں فلاح و بہتری کی صورت پیدا ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ نے فنکار اور ہنرمند کا مرتبہ اس سے بھی بلند قرار دیا ہے۔ اُن کے خیال میں ایسا ادیب اور فنکار جو کسی قوم کی باطنی صلاحیتوں کو نہ اُبھار سکے۔ اُن کے ضمیر کو نہ زندہ کر سکے اور صحیح معنوں میں قوم کے لئے ایک انتہائی اولیٰ رہبر و رہنما نہ ہو ادیب یا فنکار کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اگر وہ ایک سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا فریضہ انجام دینے کے بجائے محض اور محض تفریح کا سامان ہی مہیا کرنے پر اکتفا کرتا ہے تو اُسے قوم کا میت بردار ہی کہا جا سکے گا قوم کا مسیحا تو ہم اُسے نہ کہہ سکیں گے جو اُس کا صحیح مقام ہے ؎

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل — ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات — صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

غیر منقسم ہندوستان میں اور پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ خاص طور پر متنازعہ فیہ بنا رہا ہے کہ آیا فن کو کسی تعمیری مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے یا اسے صرف تفریحِ محض

کے طور پر ہی دماغی عیاشی کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ ایک طبقہ ایسا تھا اور اب بھی ہے جو فن سے کسی قسم کے بھی تعمیری کام لینے کے خلاف ہے چاہے وہ ملت کے تن مردہ میں روح پھونکنے کے مترادف ہی کیوں نہ ہو۔ بعض لوگ تو ادب برائے زندگی کا محض یہی مطلب لئے ہوئے ہیں کہ اس نعرے کا مطلب ہی سوشلزم کو مضبوط بنانا ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت ہی میں آواز بلند کی جانی چاہئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اور اب برائے زندگی سے تو یہ مراد ہے کہ ادب اتنا دلکش اور حسین ہونا چاہئے کہ اس سے زندگی کے دکھوں کو دور کرنے کا مداوا تفریح کی صورت میں بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اتنی ابدیت بھی ہو کہ وہ حتی المقدور اپنے ماحول، اپنے معاشرہ۔ اپنے ملک بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہر قسم کی برائی کو بنظرِ عمیق دیکھے اور قوم کے معالج کے طور پر ان برائیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں قوم کو بتائے ہوئے ان کے خلاف سراپا جہاد ہو جائے۔ بعض حضرات علامہ اقبالؒ کے بارے میں بھی یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ وہ ادب برائے زندگی کے نہیں بلکہ ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ میں حیران ہوں کہ وہ کس طرح اس غلط نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اتنی ہی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ تو تعمیرِ ملت، مذہب کی نشاۃ ثانیہ اور بین الاقوامی طور پر دورِ حاضر کی مشرق و مغرب کی تہذیب کے عیوب کو رفع کرنے کی رو میں اس قدر زیادہ مستغرق تھے کہ ان کا ایک شعر بھی اس عظیم مقصد سے عاری معلوم نہیں ہوتا۔ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود بھی انھیں محض تفریحِ طبع کا ہی مرقع سمجھا جائے۔ خود علامہ اقبالؒ ہنروران ہند کے بارے میں یوں فرماتے ہیں ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں — زندگی سے ہنرِ ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

معاشرے میں عورت کے مقام سے متعلق علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آدمیت کے احترام کی طرح وجودِ زن کی اہمیت اور اُس کے احترام پر بھی اُنھوں نے بہت زور دیا ہے۔ اُنھوں نے متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ مرد مختلف میدانوں میں عورتوں سے کہیں زیادہ عروج کے مقام پر پہنچے ہیں اور انسانیت کی فلاح کے سلسلے میں جن شخصیتوں نے نام پیدا کیا اگرچہ اُن میں بہت زیادہ تعداد مردوں کی ہے لیکن اُن سب شخصیتوں کی تخلیق اور بنیادی تربیت تو آخر عورتوں نے ہی کی۔ للٰذا اُن عورتوں کے مقام کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں جنھوں نے ایسے ایسے درخشندہ ستاروں کو جنم دیا۔ آزادیٔ نسواں کے مسئلے پر علامہ اقبالؒ کے خیالات بہت متوازن ہیں۔ وہ آزادیٔ نسواں کے پُرزور حامی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دخترانِ ملت پر یہ چیز واضح کرتے ہیں کہ بے معنی آرائش و زیبائش کا شوق اور زرق برق زیورات کی کشش بے معنی ہے۔ اُنھیں آزادیٔ نسواں کی قدر کرتے ہوئے دل و نگاہ کی قوتوں کو تیز تر کرنا چاہیے اور بحیثیت ماں، بیوی، بہن اور بیٹی کے اپنی ذمہ داریوں کو پہچانتے ہوئے دلی جذبے سے اپنے فرائض کو عملی جامہ پہنانا چاہیے تاکہ وہ سوسائٹی کی ترقی و تعمیر میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ زیبائش و آرائش کے پیچھے بے معنی طریقے سے بھاگنے کی اُنھوں نے واضح طور پر مذمت کی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر فرنگی معاشرت کو نشانۂ ہدف بنایا ہے۔ آزادیٔ نسواں کے نام پر بے حیائی

اور بے شرمی کی جو دبا وہاں چلی ہوئی ہے اور اب اُن کی تقلید میں مشرق بھی اُسی ڈگر پر چل نکلا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے برملا طور پر زندہ تہذیب کے لئے مُہلک قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان متوازن تعلقات اور مرد کو عورت کی حفاظت کا ضامن قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدراہ عورتوں کی بے راہ روی کا بھی اُنھوں نے بنیادی طور پر مرد کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اُن کے خیال میں عورت ذات بنیادی طور پر شریف ہوتی ہے اور شرافت کی زندگی ہی کو پسند کرتی ہے لیکن یہ مردوں کی زن ناشناسی ہے کہ وہ خود غرضانہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اُنھیں غلط راہ پر چلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ — اسی کے ساز ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

آزادیٔ نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیٔ نسواں کے زمرد کا گلوبند

عورت کی حفاظت

نے پردہ نہ تعلیم۔ نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

عورتوں کی تعلیم پر علامہ حاضرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم پر بھی زور دیا ہے تاکہ وہ قلب و نظر کی روشنی سے محروم نہ ہونے پائیں اور اپنے فرائض کو پہچانیں ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

انگریزوں نے ہندوستان کے لئے جو تعلیمی نظام رائج کیا تھا وہ صرف اُن کے اپنے مقاصد حل کرتا تھا انھیں سرکاری دفاتر چلانے کے لئے کلرکوں کی ایک فوج کی ضرورت تھی۔ اُن کے لئے تھوڑی بہت انگریزی تعلیم لازمی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ انھیں ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن کے دل میں آزادی کی اُمنگ پیدا ہو یا انقلاب کے جذبات بیدار ہوں بلکہ روحانی لٹریچر اور تقدیر پرستانہ فلسفہ اُن کے لئے سکولوں اور کالجوں میں رائج کیا گیا جس سے ان غلاموں کے مردہ ضمیروں کو ہمیشہ کے لئے ہی خوابیدہ کر دیا جائے۔ اور جینے کی ہمت ہی ان میں کروٹ نہ لے۔ علامہ اقبال نے ایک ماہر نباض کی طرح اس سب کو محسوس کیا اور ہمارے مدرسوں کے ان بنیادی نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے قوم کے طلبا اور اساتذہ پر واضح کیا کہ طلبا کو صرف انگریزوں کی رائج کردہ کتب پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے جو ان کی جبلی صلاحیتوں کو بیدار

کرنے کی بجائے اُن کو ختم کرنے کے درپے رہتی ہیں بلکہ اپنی خودی کو بیدار کرنے یعنی اپنی صلاحیتوں سے مکمل طور پر استفادہ کرتے ہوئے انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ تعمیری کام کرنا چاہیے اور مردانِ مجاہد کے لئے انقلاب سے ڈرنے کی بجائے ہر عظیم سے عظیم خطرے سے ٹکرانے اور اس پر قابو پانے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے اور صرف اسی صورت میں وہ اپنی اور قوم کی قسمت بدل سکتے ہیں ؎

ہندی مکتب

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اس کا سُراغ
اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا دماغ

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

طالبِ علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

مدرسہ

عہدِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز — ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے — قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

افغانستان کے ساتھ اپنی محبت اور خلوص کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی مختلف تصانیف میں جگہ جگہ نہایت پُردرد انداز میں کیا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ میں افغانستان نے ہمیشہ ایک درخشندہ کردار ادا کیا ہے۔ جب بھی دہلی کی مرکزی ہوتی لگتی اور اسلام کی نیا بیاں ڈولنے لگتی کوئی نہ کوئی مجاہد افغانستان کی سرزمین سے اُٹھتا اور اس ڈولتی ہوئی کشتی کو پھر سہارا دے کر اسلام کا جھنڈا بلند کرتا۔ محمد بن غوری اور محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک جتنے بھی اسلامی حکمران ہندوستان پر تخت نشین رہے ہیں اُن سب کی اصل کابل کے تخت سے ہی تھی۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس برصغیر میں اسلام کی اشاعت کابل کے ان عظیم فرمانرواؤں کے زیرِ سایہ ہی ہوئی۔ چنانچہ اکثر تصانیف میں علامہ اقبالؒ نے شاہِ افغانستان کو بادشاہِ اسلام کے نام سے موسوم کیا ہے اور افغان قوم کی موجودہ بدحالی اور بے عملی پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے اپنی اصل اور عظمت یاد کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی گذشتہ کردار و عمل سے اسلام کی سرفرازی کی طرف اُنھیں مائل کیا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں محراب گل افغان کی

مختلف نظموں کا ترجمہ علامہ اقبال نے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو ؎

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اُس بندے کی دہقانی پر سُلطانی قربان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج

عالم فاسد بیچ سب ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

دانائے راز

علامہ اقبالؒ نے اپنی تصنیف "زبورِ عجم" میں جہاں قوم کو ترقی و تعمیر کے راستے پر نہایت تیزی سے گامزن ہونے کے رموز دلکش اور عام فہم پیرائے میں بتائے ہیں اُس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے انہی دلائل کی حمایت میں اہم اور دقیق فلسفیانہ نکتوں کی بھی نہایت تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ علامہ اقبالؒ خود بہت عالم و فاضل آدمی تھے۔ ڈبل ایم۔اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور فلسفہ میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری یورپ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُنھوں نے یورپی۔ مشرقی اور اسلامی علوم و فلسفہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تعلیمات و فلسفہ ہی البشرطیکہ روشن ضمیری سے اُس کی تاویل کی جائے اور صوفی و ملا کی تاویلات کو صحیح نہ مان لیا جائے بہترین اور اولیٰ ترین تعلیم اور فلسفہ، نوعِ انسان کے لئے پیش کرتی ہیں۔ اور انہی پر عمل کرنے میں اُن کی نجات مضمر ہے۔ خصوصاً مسلم اقوام کی طرف اُن کا رُوئے سخن ہے کہ وہ اپنے اسلاف

کی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ پالینے کے لئے اسلامی تعلیمات کی روح کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں کاوشِ مسلسل سے نہ گھبرائیں۔ اِس راستے میں ناکامیاں بھی ہوسکتی ہیں لیکن مسلسل کوشش کا پھل جلد یا بدیر ضرور ملتا ہے ؎

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شدہ جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامنِ اُمید ز دست — دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

(ترجمہ: میری آنکھوں کا پردہ (یعنی آنکھوں کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنے والا پردہ) بعض دفعہ گھاس کے ایک تنکے کی برابر رہ جاتا ہے اور میں نے اس طرح بعض دفعہ دونوں جہانوں کو ایک نظر میں دیکھ لیا ہے۔ عشق کی وادی (یعنی منزلِ مقصود کی وادی) اگرچہ بہت دور ہے لیکن بعض دفعہ سو سالوں کا راستہ ایک ہی آہ میں طے ہو جاتا ہے۔ تو کوشش میں متواتر لگا رہ اور اُمید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑ۔ اس طرح کبھی کبھی ایک دولت کی دولت راستے کے کنارے پڑی ہوئی مل جاتی ہے۔)

مشرقی فلسفۂ حیات کو اپنانے اور فرنگی تہذیب و فلسفہ کے پیچھے اندھا دھند نہ بھاگنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں ؎

کشیدی بادہ ہا در صحبتِ بیگانہ بے درپے
بنورِ دیگراں افروختی پیمانہ بے درپے
ز دستِ ساقیٔ خاور دو جامِ ارغواں در کش
کہ از خاکِ تو خیزد نالۂ مستانہ بے درپے
ولے کو از تب و تابِ تمنا آشنا گردد

زند بر شعلہ خود را صورتِ پروانہ پے در پے
مگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کمتر گوئے
ہزاراں کارواں بگذشت ایں پروانہ پے در پے

(ترجمہ: تو نے غیروں کی محبت میں متواتر شراب پی ہے اور دوسروں کے نور سے بار بار اپنے پیمانہ کو روشن کیا ہے۔ مشرقی ساقی کے ہاتھ سے بھی دورِ غوانی جام پی کیونکہ تیری خاک سے متواتر مستانہ نالے بلند ہو رہے ہیں۔ ایسا دل جو تمنا کی تب و تاب سے آشنا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو شعلے پر پروانے کی صورت بار بار مارتا ہے۔ تو صبح صادق کے آنسوؤں سے زندگی میں پھل اور پھول پیدا کر۔ جب تک کہ تو بار بار وانہ نہیں ڈالے گا تیری کھیتی ویران ہو جائے گی۔ جام کو گردش میں لا اور فرنگ کے ہنگامہ کے بارے میں کم باتیں کر۔ اس ویرانہ سے ہزاروں کارواں یکے بعد دیگرے گذرے ہیں۔)

ان اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مشرقی فلسفہ پر زور دینے اور اندھا دھند مغربی فلسفے سے احتراز کرنے کے ساتھ ساتھ نالۂ نیم شبی یعنی دن رات کی محنتِ شاقہ۔ تب و تاب تمنا یعنی دلکش تمناؤں کو پالینا اور اُن کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہدِ مسلسل سے کام لینا اور اشکِ سحرگاہی یعنی صبح خیزی کی عادت اور محنتِ شاقہ پر بھی ہر قدم پر زور دیا ہے۔ اُن کا مقصد واضح ہے کہ فلسفہ یا علوم، ہم کیسے ہی روشن اور اعلیٰ اپنائیں جب تک اُن کی تعلیمات پر عمل کرنے کے سلسلے میں ہم محنتِ شاقہ اور دلی جذبے سے کام کرنے کی عادت نہ اپنائیں گے وہ سب فلسفہ و تعلیمات دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ بلکہ ہماری بے عملی کی وجہ سے ان تعلیمات کی بھی سبکی ہو گی جیسا کہ دورِ حاضر کے عالمِ اسلام کی بے عملی نے اسلام کی منور تعلیمات کا حشر کیا ہے۔ مغرب کا فلسفہ اور تعلیمات اسلام

کی تعلیمات کی نسبت بہت فرومایہ ہیں۔ اسلام خرد کے استعمال کے ساتھ دلی جذبات کے احترام پر زور دیتا ہے۔ جو خرد کے غلط اور بے جا استعمال سے ہمیں روکتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے صرف خرد کے استعمال پر زور دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادہ پرستی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں جس سے ملوکیت اور استحصال اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ مشرقی ممالک کی لوٹ کھسوٹ جسے مغربی ممالک نے اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ (اسی خرد کے بے رحمانہ استعمال کی وجہ سے ہوا۔ خرد کے بے رحمانہ استعمال کی اسی قسم کی رَو اگر چل نکلی تو وہ دن دُور نہیں کہ تہذیب و تمدن اور ترقی ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ اس طرح جہاں علامہ اقبالؒ نے مذہب و سیاست یا ملک و دین کے درمیان متوازن ہم آہنگی پر زور دیا ہے اس سے بھی یہی مراد ہے کہ سیاست میں جب تک مذہب اور دلی جذبات کا احترام موجود نہ ہو جس سے بحیثیتِ مجموعی آدمیت کی بہتری اور مختلف طبقات سے منصفانہ سلوک بھی مراد ہے تو ایسی سیاست، سیاست نہ رہے گی بلکہ سفاکی بن جائے گی۔

یورپ نے گذشتہ ایک دو صدیوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مسلمان جو اپنے کمال کے بعد زوال پذیر رہے ہیں تو اس کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی فلسفہ معاشی نظام اور طرزِ حکومت لازمی طور پر اسلامی و مشرقی نظام ہائے معاش و حکومت اور علم سے لازمی طور پر بہتر ہوں گے تبھی تو وہ دورِ حاضر میں ہم سے بازی لے گئے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ استدلال کسی طرح صحیح نہیں۔ مغرب کو ترقی تو اس طرح ہوئی کہ انھوں نے ہمارے علوم و فلسفہ سے تو بھرپور استفادہ کیا اور خرد کی کارفرمائیوں کو عروج تک پہنچایا لیکن مذہبیت اور دلی جذبات سے عاری ہونے کی وجہ سے استحصال کو سفاکی کی حد تک پہنچا دیا اور مادہ پرستی ہی کو دینِ ایمان سمجھا۔ اس کے علاوہ تہذیب مغربی نے

سبھی مذہب سے مکمل بیگانگی کی وجہ سے بے حیائی، بے شرمی اور بے غیرتی کی جو انتہا کی ہوئی ہے وہ بالآخر ان کی اپنی خودکشی پر ہی منتج ہوگی۔ اس کے برعکس دورِ حاضر کے مسلمان نے اسلام کی روح کو غیر مسلموں کے سپرد کرکے خود صرف اسلام کے نام کو چپنے اور فرنگیت کی ہر قسم کی برائی کو اپنانے میں ہی اپنی شان سمجھی۔ کاش ہم لوگ اپنے اسلاف کی عظمت سے سبق سیکھتے، ان کے کارناموں کی وجوہ ڈھونڈتے اور کردار و عمل کا جائزہ لیتے ہوئے اُن ہی کی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اپنے دورِ جاہلیتِ ثانی کا خاتمہ کرنے کے قابل نہ ہوجاتے۔ آخر مغربی اقوام بھی تو اسی دُنیا کی باسی ہیں اور ان قوموں کے افراد ہمیں جیسے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ اگر وہ اپنے نسبتاً ادنیٰ فلسفہ و حکمت کے باوجود اس حیرت انگیز ترقی کا باعث بن سکتے ہیں تو ہم اپنے شاندار ماضی اور تابناک روایات کے باوجود ان کے ہم پلہ کیوں نہیں ہو سکتے یا اُن سے بازی کیوں نہیں لے جاسکتے ؎

بیا کہ خاوریاں نقشِ تازۂ بستند دگر مرو بطوافِ بتے کہ بشکستند
چہ جلوہ ایست کہ دلہا بلذّتِ نگہے ز خاک راہ مثالِ شرارہ بر جستند
تو ہم بذوق خودی رَس کہ صاحبانِ طریق بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند
غلامِ ہمّتِ بیدارِ آں سوارانم ستارہ را بسنانِ شکستہ در گرہ بستند

(ترجمہ: آکہ مشرقیوں نے تازہ نقوش استوار کئے ہیں۔ دوبارہ اُس بُت کے طواف میں مت جاؤ جسے اُنھوں نے توڑ دیا ہے۔ یہ کیسا جلوہ ہے کہ اُس کی ایک جھلک کی لذّت کے لئے راستے کی خاک سے چنگاری کی طرح اُچھل پڑے ہیں۔ تو بھی اپنی خودی کے ذوق و شوق سے وہاں تک پہنچ جو کہ پہنچے ہوئے سب دنیا کو چھوڑ کر اپنے آپ سے پیوست

ہو جاتے ہیں (یعنی اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے پر بروئے کار لاتے ہیں) میں اُس سوار کی بیدار ہمت کا غلام ہوں جس نے ستارے کو اپنے نیزے میں پرو کر اپنے دامن میں باندھ لیا)۔

اس اقتباس میں جیسا کہ ظاہر ہے مشرقی نقوش کو ثبات دینے کے علاوہ بلند ہمتی پر بھی زور دیا ہے۔ بلند ہمتی کی توضیح علامہ اقبال رحؒ یوں کرتے ہیں کہ کسی ایک بلند مقصد کو حاصل کر لینے کے بعد آدمی کو چاہیے کہ مطمئن ہو کر اپنی جدوجہد چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لا کر اُس سے بھی بلند تر اور پھر اس کے بعد مزید بلندی پر پہنچنے کے لئے جدوجہد جاری رکھے۔ اور اس طرح تمام عمر بلند سے بلند پروازی کا شوق پورا کرتا رہے تو کیا عجب کہ وہ عقل و دل و نگاہ اور دستِ جہاں کشا کی الگ الگ انتہائی منزلوں تک پہنچ جانے میں کامیاب نہ ہو جاتے ؎

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب
از خلشِ کرشمہ کار نمی شود تمام
عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب
عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را
جامِ جہاں نما مجو دستِ جہاں کشا طلب

(ترجمہ: سب لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر اور کسی دانائے راز کی صحبت کا طالب ہو۔ خدا سے بھی خود طلب کر اور خودی سے بھی خدا کا طالب ہو۔ خلش ایسی ہو کہ کسی ایک کامیابی کو اپنے کام کی انتہا نہ سمجھا جائے بلکہ عقل، دل اور نگاہ کے لئے الگ الگ جلوے طلب کئے جائیں۔ کائنات کے شیشے کے آخری سرے تک پہنچ جانے کا نام عشق

ہے۔ تو جامِ جہاں نما کی تلاش نہ کر بلکہ ساری دنیا کو فتح کر لینے والے بازو کی خواہش کر)۔
صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والے تفکرات (بلند خیالی) کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

درونِ سینۂ آدم چہ نور است — چہ نور است ایں کہ عینِ او حضور است
شمارِ روزگارش از نفس نیست — چنیں جوینده و یابنده کس نیست
گہے واماندہ و ساحل مقامش — گہے دریائے بے پایاں بجامش
ہمیں دریا ہمیں چوبِ کلیم است — کہ از وے سینۂ دریا دو نیم است
غزالے مرغزارش آسمانے — خورد آبے ز جوئے کہکشانے
ز جوئے خویش بحرے آفریند — گہر گردد بہ قعرِ خود نشیند
ہُما دم صورتِ دیگر پذیرد — شود غواص و خود را باز گیرد
درو ہنگامہ ہائے بے خروش است — درو رنگ و صدائے چشم و گوش است
حیات از وے بہ اندازد کمندے — شود صیادِ ہر پست و بلندے
از و خود را بہ بندِ خود درآرد — گلوئے ماسوا را ہم فشارد
دو عالم می شود از وے شکارش — فتد اندر کمندے تا بدارش

(ترجمہ: آدمی کے سینے میں یہ کیسا نور ہے کہ یہ عین میں اللہ تعالیٰ کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا شمار سانس کی وجہ سے نہیں ہے۔ ایسا ڈھونڈنے والا اور پانے والا یعنی کامیاب جدوجہد کرنے والا) کوئی شخص نہیں ہے۔ کبھی وہ تھکا ہوا ہوتا ہے تو ساحل اُس کا مقام ہوتا ہے اور کبھی بغیر کنارے والا سمندر اُس کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہی وہ سمندر ہے اور یہی وہ کلیم کا عصا ہے جس کی وجہ سے سمندر کا سینہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا

ہرن ہے جس کا مرغزار آسمان ہے ۔ یہ کہکشاں کی ندی سے پانی پیتا ہے ۔ اپنی ندی سے ایک سمندر پیدا کرتا ہے ۔ اُسی وقت وہ دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ غوّاص بن جاتا ہے اور اپنے آپ کو دوبارہ حاصل کر لیتا ہے ۔ اُس میں بغیر شور کے ہنگامے موجود ہیں ۔ اُس میں بغیر آنکھ اور کان کے رنگ اور آواز ہے ۔ زندگی سے اُس سے کمند پھینکی جاتی ہے اور وہ ہر پست اور بلند کی صیّاد بن جاتی ہے ۔ وہ اپنے ہی ذریعے اپنی صلاحیتوں پر قابو پا لیتا ہے اور ماسوا کے گلے کو پھاڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ دونوں جہان اُس کا شکار بن جاتے ہیں اور ان کی چمک اُس کی کمند میں آجاتی ہے ۔)

علم اور شعور و آگہی کو حیاتِ پُرنفس کے بحرِ رواں کا کنارہ بتاتے ہوئے اس مسئلے کی وضاحت یوں فرماتے ہیں ۔

حیاتِ پُرنفس بحرِ روانے — شعور و آگہی اُو را کرانے
چہ دریائے کہ ژرف و موجہ بار است — ہزاراں کوہ و صحرا بر کنار است
مپرس از موج ہائے بیقرارش — کہ ہر موجش بروں جست از کنارش
گذشت از بحر و صحرائے داو — نگہ را لذتِ کیفِ و کمے داو
بر آں چیزے آید در حضورش — منوّر گردد از فیضِ شعورش
بخلوت مست و صحبت ناپذیر است — ولے ہر شے ز نورش مستنیر است
تخستیں می نماید مستنیرش — کند آخر بآئینے اسیرش
شعورش با جہاں نزدیک تر کرد — جہاں اُو را ز راز او خبر کرد
خرد بند نقاب از رُخ کشودش — ولیکن نطق عریاں تر نمودش
نگنجد اندریں دیرِ مکافات — جہاں اُو را مقامے از مقامات

(ترجمہ: سانسوں سے بھری ہوئی زندگی ایک بہتا ہوا سمندر ہے۔ شعور و آگہی اُس کا کنارہ ہے یہ ایک ایسا سمندر ہے جو موتیوں اور موجوں سے بھرا ہوا ہے کہ جس کی ہر موج اُس کے کنارے سے باہر پھلانگ کر پہنچی۔ وہ سمندر سے باہر نکل آئی اور اُس نے صحرا کو نمی عطا کی۔ اُس نے نگاہ کو کیف و سرور کی لذت دی۔ اُس کے سامنے جو چیز بھی آتی ہے وہ اُس کے شعور کے فیض سے منور ہو جاتی ہے۔ وہ خلوت میں مست اور اُس کی صحبت میں ناقابلِ پذیرائی ہے۔ پہلے تو وہ اپنا نور دکھاتی ہے اور آخر کار اپنے آئینے میں اُسے اسیر کر لیتی ہے۔ اُس کے شعور نے دنیا سے اُسے نزدیک کر دیا۔ جہان نے اُسے اپنے راز سے خبردار کر دیا خرد نے نقاب کا بند اُس کے چہرے سے کھول دیا لیکن نطق نے زیادہ وضاحت سے اُس کی نمائش کی۔ وہ اس دریافت میں نہیں سماتا۔ یہ جہاں اُس کے لئے بہت سے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔)

بے یقینی اور دلی جذبے سے کئے جانے والے بلند مقصد کام میں یقین کی صورت کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

حکیماں مردہ را صورت نگارند　　ید موسیٰ دمِ عیسیٰ ندارند
دریں حکمت دلم چیزے ندید است　　برائے حکمتِ دیگر تپید است
من ایں گویم جہاں در انقلاب است　　درونش زندہ و در پیچ و تاب است
ز اعداد و شمارِ خویش بگذر　　یکے در خود نظر کن پیش بگذر
دریں عالم کہ جزو از کل فزوں است　　قیاسِ رازی و طوسی جنون است
زمانے با ارسطو آشنا باش　　دمے با سازِ بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقامِ شاں گذر کن　　مشو گم اندریں منزل، سفر کن

بآں عقلے کہ داند بیش و کم را شناسد اندرونِ کان و یم را
جہاں چند و چوں زیرِ نگیں کُن بگردوں ماہ و پرویں را کمیں کُن
ولیکن حکمتِ دیگر بیاموز رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز
مقام تو بروں از روزگار است
طلب کن آں یمیں کو بے یسار است

(ترجمہ: حکما مُردے کی صورت دیکھتے ہیں۔ وہ موسےٰ کا عصا یا عیسیٰ کی سانس نہیں رکھتے۔ اِس حکمت میں میرے دل نے کوئی چیز نہیں دیکھی ہے اور وہ کسی اور ہی حکمت کے لئے تڑپتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا انقلاب میں ہے۔ اُس کا دل زندہ ہے اور پیچ و تاب میں ہے۔ تو اپنے اعداد و شمار کو چھوڑ دے۔ ایک دفعہ تو اپنے اندر نظر کر (یعنی اپنے آپ میں پوشیدہ صلاحیتوں پر غور کر) اور آگے بڑھتا جا۔ اِس دُنیا میں جس کا ایک حصّہ کُل سے زیادہ ہے۔ رازی اور طُوسی کا قیاس جنوں ہے۔ کبھی تجھے چاہئے کہ ارسطوؔ سے ہم آشنا ہو اور کبھی بیکنؔ کا ہم نوا ہو۔ لیکن تو ان کے مقام سے گزر جا۔ تو اس منزل میں گُم مت ہو جا بلکہ سفر کرتا رہ (یعنی آگے بڑھتا رہ) اُس عقل کے ساتھ جو کمی اور بیشی کو جانتا ہے اور کان اور سمندر کے اندر کے حالات جانتا ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا کو تو زیرِ نگیں کر لے اور آسمان میں چاند اور ستاروں کو مفتوح کر۔ لیکن تو دوسری حکمت سیکھ اور اپنے آپ کو اِس دن اور رات کے مکر سے آزاد کر دے۔ تیرا مقام اِس زمانے سے باہر ہے۔ تو اُس مشرق کی تلاش کر جس کا کوئی مغرب نہ ہو۔)

خودی یعنی اپنی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

خودی تعویذِ حفظِ کائنات است
نخستیں پرتوِ ذاتش حیات است

حیات از خوابِ خوش بیدار گردد
درونش چوں یکی بسیار گردد

نہ اُو را بے نمودِ ما کشودے
نہ ما را بے کشودِ اُو نمودے

ضمیرش بحرِ ناپیدا کنارے
دلِ ہر قطرہ موجِ بیقرارے

یکے بنگر بخود پیچیدنِ اُو
زخاکِ پے سپر بالیدنِ اُو

نہاں از دیدہ ہا در ہاؤ ہوئے
دما دم جستجوئے رنگ و بوئے

ز سوزِ اندروں در جست وخیز است
بآئینے کہ با خود در ستیز است

خودی را پیکرِ خاکی حجاب است
طلوعِ اُو مثالِ آفتاب است

درونِ سینۂ ما خاورِ اُو
فروغِ خاکِ ما از جوہرِ اُو

تو می گوئی مرا از من خبر کن
چہ معنی دارد اندر خود سفر کن

ترا گفتم کہ ربطِ جان وتن چیست
سفر در خود کن و بنگر کہ "من" چیست

سفر در خویش زادن بےحاب وجام
ثریا را گرفتن از لبِ بام

ابد بُردن بیک دم اضطرابے
تماشائے شعاعِ آفتابے

ستردن نقشِ ہر امید و بیمے
زدن چاکے بدریا چوں کلیمے

شکستن ایں طلسمِ بحر وبر را
ز انگشتے شگافیدن قمر را

چناں باز آمدن از لامکانش
درونِ سینہ او در کف جہانش

مشو غافل کہ تو اُو را امینی
چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

(ترجمہ: خودی حفظ کائنات کا تعویذ ہے۔ اس کی ذات کا سب سے پہلا پرتَو

زندگی ہے۔ زندگی اچھی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے۔ اس کی اندرونی صلاحیتیں وحدانیت کی طرح مضبوط ہو جاتی ہیں۔ نہ اُس میں بغیر ہماری نمائش کے کشادگی ہے اور نہ ہمیں بغیر اُس کی کشادگی کے نمائش ہے۔ اُس کا ضمیر ایک بے پایاں سمندر ہے اور ہر قطرے کا دل ایک بے قرار موج کی طرح ہے۔ ایک دفعہ تو اُس کے پیچ و تاب اور سوزش کو دیکھ قطروں سے اُس کا شور و غوغا چھپا ہوا ہے۔ ہر لمحہ اُسے رنگ و بو کی تلاش ہے۔ وہ اپنے اندرونی سوز کی وجہ سے جد و جہد میں مشغول ہے' اُس آئینے کی طرح جو اپنے آپ سے محوِ ستیز ہے۔ خودی کے لئے خاکی پیکر ایک پردہ ہے اُس کا طلوع ہونا آفتاب کی مانند ہے اُس کا مشرق ہمارے سینہ کے اندر ہے۔ تو مجھے کہتا ہے کہ مجھے میرے ہی متعلق خبردار کر اور "اپنے آپ سے آگاہ ہو" کے کیا معنی ہیں؟ میں نے تجھے بتایا کہ جان اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تو اپنے آپ میں سفر کر اور دیکھ کہ "میں" کیا چیز ہے۔ اپنے آپ میں سفر یوں ہے کہ بغیر ضروری ساز و سامان کے اس دنیا میں آنا اور اوج ثریا کو تسخیر کر لینا (یعنی اپنی ہی کوششوں اور جد و جہد سے عروج تک پہنچنا۔ یعنی SALF MADE شخصیتوں کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ ایک لمحہ کے اضطراب سے اور آفتاب کی ایک شعاع کا نظارہ کرنے سے قیامت بپا کر دینے کے مترادف ہے۔ ہر اُمید و بیم کے نقش کو پامال کرنے اور دریا میں کلیم کی طرح شگاف ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس بحر اور بر کے طلسم کو توڑ دینے اور اُنگلی سے چاند میں شگاف ڈال دینے کے برابر ہے۔ لامکان سے اس طریقے سے واپس آنا ہے کہ سینہ میں وہ خود (یعنی اللہ تعالیٰ ہو) اور اُس کی بغل میں جہان ہو۔ تو غافل مت ہو، تو اُس کا امین ہے۔ تو کیسا نادان ہے کہ اپنی طرف نہیں دیکھتا)

قوم کی امامت کے لئے ایک مردِ تمام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات

کا اظہار کیا ہے۔ اس معاملے میں مغربی طرز کی جمہوریت کو اندھا دھند اپنا لینے کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے اور مغربی طرزِ جمہوریت کے نقائص کو واضح کیا ہے ؂

مجو پایاں کہ پایانے نہ داری   بپایاں تارسی جانے نہ داری
نہ مارا پختہ پنداری کہ خامیم   بہر منزل تمام و ناتمامیم
بہ پایاں نارسیدن زندگانی ست   سفر مارا حیاتِ جاودانی ست
بخود پیچیم و بے تابِ نمودیم   کہ ما موجیم و از قعرِ وجودیم
دمادم خویش را اندر کمیں باش   گریزاں از گماں سوئے یقیں باش
تب و تابِ محبت را فنا نیست   یقین و دید را نیز انتہا نیست
کمالِ زندگی دیدارِ ذات است   طریقش رستن از بندِ جہات است

کسے کو "دید" عالم را امام است
من و تو ناتمامیم او تمام است

اگر او را نیابی در طلب خیز   اگر یابی بدامانش در آویز
بکارِ ملک و دیں او مردِ راہے است   کہ ما نوریم و او صاحب نگاہے است
مثالِ آفتابِ صبحگاہے   دمد از ہر بنِ مویش نگاہے
فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است   رسن از گردنِ دیوے گشاد است
خرد مجز کافری کافرگری نیست   فنِ افرنگ جز مردم دری نیست
گروہے را گروہے در کمین است   خدایش یار اگر کارش چنیں است
ز من دِہ اہلِ مغرب را پیامے   کہ جمہور است تیغِ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہا می ستاند   تمیزِ مسلم و کافر نداند

نہ ماند در غلافِ خود زمانے
بُرد جانِ خود و جانِ جہانے

(ترجمہ: تو انتہا کو تلاش نہ کر چونکہ تیری کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو ہیں پختہ نہ سمجھ چونکہ ہم خام ہیں ہر منزل میں ہم مکمل ہیں لیکن پھر بھی نامکمل ہیں (جہدِ مسلسل کی تلقین) انتہا تک نہ پہنچنا ہی زندگی ہے (یعنی کسی انتہا پر اکتفا نہ کرنا ہی زندگی ہے) سفر ہمارے لئے حیاتِ جاوداں ہے۔ ہم اپنے آپ سے پیچ و تاب کھاتے ہیں اور نمائش کے لئے بے تاب ہیں کہ ہم موج ہیں اور اپنے وجود کی گہرائیوں سے ہمارا تعلق ہے۔ ہر لحظہ اپنے آپ کو تسخیر کرنے کی فکر میں رہ (یعنی اپنی ہر صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کر) شکوک و شبہات سے یقین کی طرف دوڑ۔ محبت کی تب و تاب کو فنا نہیں ہے یقین اور نگاہ کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ زندگی کا کمال ذاتِ الٰہی کا دیدار ہے۔ اُس کا طریقہ اطراف کی قید سے آزاد ہو جانا ہے۔ وہ شخص جس نے نگاہِ "دوررس" حاصل کر لی۔ وہ امام ہے میں اور تو ناتمام ہیں اور وہ تمام ہے۔ اگر تو اُسے نہ پائے تو اُس کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہو۔ اور اگر تو اُسے پالے تو تُو اُسے اپنے دامن میں باندھ لے۔ ملک و دین کے کاموں میں وہ راہِ راست پر چلنے والا آدمی ہے کیونکہ ہم اندھے ہیں اور وہ صاحبِ نگاہ ہے۔ صبح کے آفتاب کی مانند اُس کے ہر بال کے کنارے سے ایک نگاہ اُگ آتی ہے۔ فرنگ نے جمہوری آئین کی بنیاد ڈالی ہے۔ اُس نے ایک دیو کی گردن سے رسّہ کھول دیا ہے۔ خرد سوائے کافری کے اور کوئی کافرگری نہیں ہے۔ فرنگ کا فن سوائے لوگوں کو آزار پہنچانے کے کچھ نہیں ہے۔ ایک گردہ کے پیچھے دوسرا گردہ کی گھات لگائے بیٹھا ہے اگر اس کے معاملات ایسے ہی ہیں تو اُس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میری طرف سے اہلِ مغرب

کو یہ پیغام دو کہ جمہور ایک بے نیام تلوار کی مانند ہے۔ وہ کیسی تلوار ہے مسلم اور کافر میں فرق نہیں جانتی۔ وہ اپنے غلاف میں کسی وقت بھی نہیں رہتی - وہ اپنی جان اور جہان کی جان کو فنا کر دیتی ہے۔)

علامہ اقبالؒ نے آزاد اقوام کے فنون کا بھی بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کا غلامی کے عہد کے فنون سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بندگی کے فنون خواب خرگوش کو مزید خوابیدہ کرنے کے باعث ہوتے ہیں اور آزاد اقوام کے فنون آزادی کی عظمت و سطوت کے مظہر ہوتے ہیں ؎

یک زماں با رفتگاں صحبت گزیں — صنعتِ آزاد مرداں ہم ببیں
خیز و کار ایبک و سوری بنگر — در نما چشمے اگر داری جگر
خویش را از خود بروں آوردہ اند — ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند
سنگہا با سنگہا پیوستہ اند — روزگارے را بآبے بستہ اند
دیدنِ اُو پختہ تر سازد ترا — در جہانِ دیگر اندازد ترا
وائے من از خویشتن اندر حجاب — از فراتِ زندگی ناخوردہ آب
وائے من از بیخ و بُن برکندۂ — از مقامِ خویش دُور افگندۂ
محکمی ہا از یقینِ محکم است — وائے من شاخِ یقینم بے نَم است

در من آں نیروئے اِلّا اللہ نیست
سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست

یک نظر آں گوہرِ نایاب بنگر — تاج را در زیرِ مہتابے بنگر
مرمرش زاب رواں گردندہ تر — یک دم آنجا از ابد پایندہ تر

عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت — می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت
ہمتِ اُو آنسوئے گردوں گذشت — از جہانِ چند و چوں بیروں گذشت
زانکہ در گفتن نیاید آنچہ دید
از ضمیرِ خود نقابے بر کشید

(ترجمہ: ایک لمحہ تو گذرے ہوؤں کی محبت ڈھونڈ اور آزاد مردوں کی صفت کو ملاحظہ کر۔ تو اُٹھ اور ایبک اور سوری کے ماحول کو دیکھ۔ اگر تو جگر رکھتا ہے تو ان پر نظر ڈال وہ اپنے آپ کو اپنے آپ سے باہر لے آئے ہیں اور اس طرح اُنھوں نے اپنی نمائش کی ہے۔ اُنھوں نے پتھروں کو پتھروں سے جوڑا ہے اور ایک زمانے کو آب و تاب دی ہے۔ اُس کا دیکھنا تجھے اور زیادہ پختہ بنا دیتا ہے اور تجھے ایک دوسری ہی دنیا میں لے جاتا ہے۔ مجھ پر حیف ہو کہ میں اپنے آپ ہی سے شرم میں ہوں۔ زندگی کی خیرات سے میں نے پانی نہیں پیا ہے۔ مجھ پر حیف ہو کہ میں مکمل طور پر اُکھڑ چکا ہوں اور اپنے مقام سے دور جا پڑا ہوں۔ میری مضبوطی یقینِ محکم کی وجہ سے ہے۔ حیف ہو مجھ پر کہ میری یقین کی شاخ بے نم ہے۔ مجھ میں اِلّا اللہ کی وہ طاقت نہیں ہے۔ میرا سجدہ اس درگاہ کے لائق نہیں ہے۔ ایک لحظہ تو اُس گوہرِ ناب کو دیکھ۔ تاج کو چاندنی رات میں دیکھ۔ اُس کا سنگِ مرمر آبِ رواں سے بھی زیادہ گردش والا ہے۔ وہاں کا بسر کیا ہوا ایک لمحہ ابد سے بھی زیادہ پائندہ تر ہے۔ مردوں کا عشق بہشت کی طرح پاک اور رنگین ہے۔ یہ پتھر اور اینٹ سے نغمے بلند کرتا ہے۔ اُس کی ہمت آسمان کے اُس پار تک پہنچی اور اس اعداد و شمار اور تخمین و ظن کی دنیا سے آگے چلی گئی۔ اُس نے جو کچھ دیکھا وہ بتایا نہیں جا سکتا۔ اُس نے اپنے ضمیر پر سے نقاب اُٹھا لیا۔

تسخیرِ کائنات

اپنی تصنیف "جاوید نامہ" میں علامہ اقبالؒ نے ہمیں صحیح معنوں میں تسخیر کائنات کی دعوت دی ہے۔ اگر ہم آجکل کے واقعات دیکھیں اور یہ امر پیش نظر رکھیں کہ کس طرح بنی نوع انسان واقعتاً تسخیر کائنات کے عمل میں مصروف و سرگرم ہے تو ہمیں علامہ اقبالؒ کی وسعتِ نظر اور پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ آج انسان ستاروں سے آگے اور جہانوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ چاند پر تو اپنے قدموں کے نقوش ثبت کر ہی چکا ہے اس کے علاوہ مریخ اور زہرہ تک بھی اپنے مشینی کارندے بھیج چکا ہے اور اُن دنیاؤں کے بارے میں انتہائی قیمتی راز اپنے قبضے میں کر چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے شاہین بننے کی جو دعوت دی تھی وہ امریکہ کے شاہین نے تو چاند پر اُتر کر کافی حد تک پوری کر دی ہے لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے جس قوم کو گرمانے کی کوشش میں اپنا خون پسینہ ایک کیا وہ ابھی تک مردہ ہے اور ترقی کی دوڑ میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ چاند

یا ستاروں پر کمند ڈالنا تو کجا اسے تو ابھی مونٹ ایورسٹ تک پہنچنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کرنے کی ہمت عطا فرمائے تاکہ وہ علامہ اقبالؒ کی توقعات پوری کر سکے اور تسخیر کائنات میں اگر وہ پہل نہیں کر سکی تو کم از کم آئندہ کے لئے تو اس میدان میں پیچھے نہ رہے اور ہمتِ مردانہ کو کام میں لاتے ہوئے چاند اور ستاروں کو اپنی گرفت میں لائے ؎

تو ازیں نہ آسماں ترسی ؟ مترس — از فراخائے جہاں ترسی ؟ مترس
چشم بکشا بر زمان و بر مکاں — ایں دو یک حال است از احوالِ جاں
ہیچ می داند کہ در جائے فراخ — می تواں خود را نمودن شاخ شاخ

جوہرِ او چیست ؟ یک ذوقِ نمو ست
ہم مقامِ اوست ایں جوہر ہم اوست

فروغِ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ اُو گردوں شود روزے
خیالِ اُو کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
نوِ گرداب سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنیِ آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا اُفتادہ مضموں
کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

(ترجمہ: تو ان نوآسمانوں سے ڈرتا ہے؟ تو ان سے نہ ڈر۔ تو اس دُنیا کی فراخی سے ڈرتا ہے؟ اس سے نہ ڈر۔ تو زمان اور مکان پر آنکھ کھول کر نظر ڈال۔ یہ دونوں ہماری زندگی کے حالات ہی کا حصہ ہیں۔ کیا کوئی شخص جانتا ہے کہ اس وسیع زمین میں اپنی پوری صلاحیت کے اظہار کا موقع موجود ہے۔ اُس کا جوہر یعنی خاصیتِ خصوصی کیا ہے؟ اپنی نمائش کا ذوق و شوق ہے۔ یہ جوہر ہی اُس کا مقام ہے اور یہی وہ نور ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی خاصیت ہے یا فطرت کا اصول ہے کہ وہ اپنی نمائش چاہتی ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی چاہیئے کہ اِسی خاصیت کا تتبع کریں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کارناموں کی نمائش کریں۔) اس مٹھی بھر خاک کی ترقی ایک دن فرشتوں سے بھی بلند تر ہو جائے گی۔ زمین اپنی تقدیر کے ستارے کے باعث ایک دن آسمان کی صورت بن جائے گی۔ اُس کا خیال جو کہ حوادث کے سیلاب سے پرورش پا رہا ہے، نیلے آسمان کے گرداب سے ایک دن باہر ہو جائے گا۔ تو ہم سے کیا پوچھتا ہے ایک مرتبہ آدم کے خیالات کے معنی پر غور کر جو کہ ابھی اُس کی طبیعت میں بے تاب ہیں اور جو ایک دن موزوں ہو جائیں گے۔ یہ ہمارے راستے میں پڑا ہوا مضمون ایسا موزوں ہو گا کہ ایک دن یزداں کا دل اس کی تاثیر سے پُرخون ہو جائے گا)

معراج کے واقعہ کی علامہ اقبالؒ تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ ترقی کے زینے میں ایک سٹیج تو اللہ تعالیٰ کی صفات کا تتبع ہے لیکن ان صفات کے تتبع تک ہی اپنی محنت، ہمت اور جذب و شوق کو محدود کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ TARGET خود ذاتِ حق کا عالی مقام ہونا چاہیئے اور وہ عالی مقام حاصل کر لینا ہی معراج ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی برابری کے دعویدار ہیں یا کسی طرح اس سے ٹکر لینے کے متمنی ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں تسخیرِ کائنات کی دعوت دی ہے اور اُس کی صفات کا تتبع کر کے

ہم بھی تسخیرِ کائنات کے مشکل کام کو آسان کر سکتے ہیں۔ ترقی کے زینے میں کسی ایک مرحلے پر رُک جانا ہی کافی نہیں بلکہ اُس کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے سعیٔ ناتمام میں مشغول رہنا ہی ہماری فطرت ہونی چاہیئے اور یہی ترقی وتعمیر کا راز ہے ؎

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب　　　از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن　　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے　　　خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق　　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ ایں از بجائے استوار　　　حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است　　　ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نسازد با صفات　　　مصطفٰے راضی نشدُ اِلاّ بذات
چیست معراج آرزوئے شاہدے　　　امتحانے روبروئے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ او　　　زندگی ما را چو گُل را رنگ و بُو
ذرّہٴ از کف مدہ تابے کہ ہست　　　پختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تاب خود را بر فزودن خوشتر است　　　پیشِ خورشید آزمودن خوشتر است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش　　　امتحانِ خویش کُن موجود باش

ایں چُنیں موجود محمود است وبس
ورنہ نارِ زندگی دود است وبس

(ترجمہ: تو زندہ ہے یا مردہ ہے یا جاں بلب ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لئے تین شاہدوں سے شہادت طلب کر۔ پہلا شاہد تو تیرا اپنا شعور ہے۔ تو اپنے آپ کو اپنے ہی

نور سے دیکھ ۔ دوسرا شاہد کسی دوسرے کا شعور ہے۔ تو اپنے آپ کو کسی دوسرے کے نور سے پرکھ۔ تیسرا شاہد ذاتِ حق کا شعور ہے تو اپنے آپ کو ذاتِ حق کے نور سے دیکھ۔ تو اگر اس نور کے سامنے سلامت رہے تو اپنے آپ کو خدا کی طرح حیّ اور قائم شمار کر۔ اپنے مقام تک پہنچ جانا ہی زندگی ہے۔ ذاتِ حق کو بے پردہ دیکھنا ہی زندگی ہے۔ مردِ مومن صرف ذاتِ حق کی صفات کو اپنانے پر اکتفا نہیں کرتا۔ مصطفٰے سوائے ذاتِ حق کو حاصل کر لینے کے کسی اور بات پر راضی نہ ہوئے۔ معراج کیا ہے محبوب کو حاصل کرنے کی آرزو ہے۔ یہ محبوب کے سامنے ایک امتحان ہے۔ وہ ایسا عادل محبوب ہے کہ اُس کی تصدیق کے بغیر ہمارے لئے زندگی ایسی ہی ہے جیسا کہ پھول بغیر رنگ و بو کے ہو۔ تو ایک ذرّے کی مانند ہے اپنے ہاتھ سے وہ چمک نہ چھوڑ جو تجھ میں ہے بلکہ اُس چمک کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اپنی چمک کو مزید ترقی دینا بہتر بات ہے۔ اپنے پرانے پیکر کو تو نئے سرے سے تراش۔ تو اپنا امتحان کر اور 'موجودہ' اس قسم کا 'موجود' اور 'محمود' ہی بننا چاہیے ورنہ زندگی کی آگ محض دھواں ہے۔)

علامہ اقبالؒ نے اپنی اس نظم 'جاوید نامہ' میں روحِ حضرتِ رومی کے ہمراہ اور زروان کی رہبری میں جو زمان و مکان کی روح ہے، اس نظامِ شمسی کے مختلف سیاروں یعنی چاند، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل اور ان سیاروں سے بھی پرے عالمِ بالا کی سیر کا حال لکھا ہے۔ جس طرح معراجِ مصطفٰے ہمارے لئے نہ صرف حق تعالیٰ کی صفات کو اپنانے بلکہ خود ذاتِ حق کے مقامِ عالی تک پہنچنے کی ایک کھلی دعوت ہے اسی طرح علامہ اقبالؒ کی یہ خیالی سیرِ افلاک ہمارے لئے ایک چیلنج ہے، ایک دعوتِ مجاہدہ ہے اور ہماری ہمتوں کی ایک آزمائش ہے کہ ہم ان ستاروں پر کمند ڈالیں اور تسخیرِ کائنات کا موجب بنیں۔ تان یہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ غیر تو علامہ اقبالؒ کے خیالی شاہین بن گئے اور چاند اور

ستاروں پہ کامیابی سے شب خون مارتے رہے لیکن افسوس کہ اقبال کی اپنی ملت ابھی اُس مضمونِ عالی کو موزوں کرنے ہی میں مگن ہے اور ابھی اس کی تعمیر دیکھیں مزید کتنی دُور ہے کاش ہم بھی علامہ اقبالؒ کے ذوق و شوق اور جذبۂ جنوں سے سرشار ہوتے اور گوش و ہوش اور قلب و نظر کی صلاحیتوں کو مکمل طور پر اُجاگر کرکے ترقی و تعمیر کی منزلیں انتہائی تیزی سے طے کرنا شروع کر دیتے۔ اِس سیر کے دوران تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں اہم رموز مختلف مکالموں کی صورت میں اُنھوں نے ہمیں سمجھائے اور اُنھیں اچھی طرح ہمارے ذہن نشین کرانے کے لئے اُنھیں مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے ؎

جہاں دوست

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق
چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟

آدمی

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن — عالم ایں شمشیر را سنگِ فسَن
شرق حق را دید و عالم را ندید — غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن زندگی است — خویش را بے پردہ دیدن زندگی است
بندہ چوں از زندگی گیرد برات — ہم خدا آں بندہ را گوید صلوٰت

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاکِ او با سوزِ جاں ہمراہ نیست

(ترجمہ: جہاں دوست۔ دنیا رنگ کی وجہ سے ہے اور بے رنگی حق ہے۔ یعنی حق کی نظروں میں رنگ و نسل کا امتیاز بے معنی ہے۔ عالم یعنی دُنیا کیا ہے؟ آدمی کیا ہے؟ اور حق کیا ہے؟

رومی - آدمی شمشیر ہے اور حق شمشیرزن ہے۔ عالم یعنی دنیا اس شمشیر کے لئے تیز کرنے والا پتھر ہے۔ مشرق نے حق کو دیکھا لیکن دنیا کو نہ دیکھا۔ مغرب نے دنیا کو دیکھا لیکن حق سے دُور بھاگ گیا۔ حق کو آنکھ کھول کر دیکھنا زندگی ہے۔ اپنے آپ کو بے پردہ دیکھنا زندگی ہے۔ بندہ جب زندگی سے استفادہ کرتا ہے تو خدا بھی اس بندے کی خیریت چاہتا ہے۔ جو شخص اپنی تقدیر سے آگاہ نہیں ہے اُس کی خاک اپنی جان کے سوز کے ساتھ ہمراہ نہیں ہے۔)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

پیرِ ہندی اندکے دم در کشید — باز در من دید و بے تابانہ دید
گفت مرگِ عقل؟ گفتم ترکِ فکر — گفت مرگِ قلب؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردِ راہ — گفت جاں؟ گفتم کہ رمزِ لاالٰہ
گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ اوست — گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست — گفت مُجت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں، گفتم شنید — گفت دینِ عارفاں؟ گفتم کہ دید

از کلامم لذتِ جانش فزود
نکتہ ہائے دل نشیں بر من کشود

نُہ تا سخن از عارف ہندی (جاوید نامہ)

(۱)

ذاتِ حق را نیست ایں عالم حجاب — غوطہ را حائل نگردد نقشِ آب

(۲)

زادن اندر عالمے دیگر خوش است — تا شبابے دیگرے آید بدست

(۳)

حق ورائے مرگ و عین زیست است　　بندہ چوں میرد نمی داند کہ چیست

گرچہ ما مرغانِ بے بال و پریم　　از خدا در علمِ مرگ افزوں تریم

(۴)

وقت ؟ شیرینی بزہر آمیختہ　　رحمتِ عامے بقہر آمیختہ

خالی از قہرش نہ بینی شہر و دشت　　رحمتِ او ایں کہ گوئی در گذشت

(۵)

کافری مرگ است اے روشن نہاد　　کے سزد با مردہ غازی را جہاد

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ　　بر خود اُفتد ہمچو بر آہو پلنگ

(۶)

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم

بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

(۷)

چشمِ کور ست اینکہ بیند ناصواب

ہیچگہ شب را نہ بیند آفتاب

(۸)

صحبتِ گل دانہ را سازد درخت　　آدمی از صحبتِ گل تیرہ بخت

دانہ از گل می پذیرد پیچ و تاب

تا کند صیدِ شعاعِ آفتاب

(۹)

من بگل گفتم بگو اے سینہ چاک
چوں بگیری رنگ و بو از باد و خاک
گفت گل اے ہوشمند رفتہ ہوش
چوں پیامے گیری از برقِ خموش
جاں بہ تن مارا زجذب این و آں
جذبِ تو پیدا و جذبِ ما نہاں

(ترجمہ: پیرِ ہندی نے تھوڑی دیر تک اپنا دم سادھا اور پھر اُس نے میری طرف دیکھا، اور بے تابانہ طریقے پر دیکھا۔ اُس نے پوچھا کہ عقل کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ فکر کو ترک کر دینا۔ اُس نے پوچھا کہ قلب کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ذکر کو ترک کر دینا۔ اُس نے کہا کہ جسم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ راستے کی گرد سے پیدا ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا کہ جان یعنی روح کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ لاالٰہ کی رمز ہے۔ اُس نے کہا کہ آدم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ اُس کے یعنی اللہ کے بھیدوں میں سے ہے۔ اُس نے پوچھا کہ عالم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ علم و ہنر کیا ہے؟ میں نے کہا یہ محض پوست ہے۔ اُس نے کہا کہ اس کا مغز کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ دوست کا چہرہ ہے یعنی ذات برحق ہے۔ اُس نے کہا کہ عامیوں کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا کہ سنی سنائی باتیں۔ اُس نے کہا کہ عارفوں کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا کہ خود دیکھی بھالی یعنی مشاہدہ کردہ چیز۔ میری باتوں سے اُس کی جان کی لذت بڑھی اور اُس نے دل نشین نکتے مجھ پر وا کیے۔

عارفِ ہندی یعنی جہاں دوست کی طرف سے نوٹ لکھتے :۔

(۱)

ذاتِ حق کے لئے یہ دنیا حجاب کا باعث نہیں۔ نقشِ آب، غوطہ لگانے کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔

(۲)

کسی دوسری دنیا میں پیدا ہونا اچھی بات ہے تاکہ ہمیں کوئی اور شباب حاصل ہو۔

(۳)

حق، موت کے خوف سے ہٹ کر زندگی کا نام ہے اور زندگی کی اصلیت یہی ہے بندہ جب مر جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ کیا ہے۔ اگرچہ ہم بے بال و پر کے پرندے ہیں لیکن خدا سے علمِ مرگ میں بڑھ کر ہیں۔

(۴)

وقت کیا ہے؟ زہر ملی ہوئی شیرینی ہے۔ رحمتِ عام میں قہر ملا ہوا ہے۔ تو شہرِ دوست کو اُس کے قہر سے خالی دیکھتا ہے۔ اُس کی رحمت یہی ہے کہ اُس نے ہمیں بخشا ہوا ہے۔

(۵)

اے روشن نہاد کافری موت ہے۔ مردے کے ساتھ جہاد کرنا غازی کو کہاں زیب دیتا ہے۔ مردِ مومن زندہ ہے اور اپنے ساتھ جنگ میں مشغول رہتا ہے وہ اپنے ساتھ برسرِ پیکار رہتا ہے جیسا کہ چیتا پلنگ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مردِ مومن سخت محنت اور اور جہدِ مسلسل کے ذریعے اپنی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے درپے رہتا ہے۔

(۶)

بُت کے نزدیک ایک بیدار دل کافر اُس دیندار سے بہتر ہے جو حرم کے اندر سو گیا۔

(۷)

وہ شخص اندھا ہے جو ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھتا ہے۔ وہ رات کے کسی حصّے میں بھی طلوعِ آفتاب کی نشانی نہیں دیکھتا۔

(۸)

مٹی کی محبت دانے کو درخت بنا دیتی ہے لیکن (افسوس ہے) کہ آدمی مٹی کی محبت سے تاریک نصیبوں والا بنا ہوا ہے۔ دانہ مٹی سے پیچ و تاب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ آفتاب کی شعاع کو شکار بناتا ہے۔

(۹)

میں نے پھول سے کہا کہ اے سینہ چاک تو ہوا اور خاک سے کس طرح رنگ اور بو حاصل کرتا ہے۔ پھول نے کہا کہ اے حواس باختہ ہوشمند۔ جیسا کہ تو خاموش بجلی سے پیغام حاصل کرتا ہے۔ ہمارے جسموں میں روح ان جذبوں سے ہے کہ تیرا جذبہ ظاہر ہے اور میرا جذبہ پوشیدہ ہے۔)

ایک زندہ اور فعّال قوم بننے کے لئے جس میں تسخیرِ کائنات کی تمام قوتیں موجود ہوں۔ علّامہ اقبالؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں مردِ آزاد بننا چاہیے۔ ملّا کے بنائے ہوئے دین سے ہٹ کر ہمیں کردار و عمل میں سرگرمی پیدا کرنی چاہیئے۔ عقل و علم کے غلط استعمال سے پیدا کردہ بیم و رجا کی کیفیت سے ہٹ کر عشق کے راستے پر گامزن ہونا چاہیئے جو اُمید و ہراس کے شکوک و شبہات سے بالاتر ہوتا ہے۔ خلش اور کاوش کے بغیر زندگی بیکار ہے اور زندگی کو اپنی

صلاحیتیں بروئے کار لاکر اس طرح مسخر بنانا چاہیے کہ آپ خود اپنی تقدیر بن جائیں۔ جذب و شوق کے نشے میں چُور جب ہم اس دُنیا اور اس کائنات پر شبخون مارتے ہیں تو کامیابی ہمارے قدم چومتی ہے ؎

مردِ آزادے کہ داند خوب و زشت — می نگنجد روح او اندر بہشت
جنتِ مُلّا مے و حُور و غلام — جنتِ آزاد گاں سیرِ دوام
جنتِ مُلّا خور و خواب و سرود — جنتِ عاشق تماشائے وجود
حشرِ مُلّا شق قبر و بانگِ صُور — عشق شور انگیز خود صبحِ نشور
علم بر بیم و رجا دارد اساس — عاشقاں را نے اُمید و نے ہراس
علم ترساں از جلالِ کائنات — عشق غرق اندر جمالِ کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر
عشق آزاد و غیور و ناصبور — در تماشائے وجود آمد حبور
عشق ما از شکوہ ہا بیگانہ ایست — گرچہ اُو را گریۂ مستانہ ایست
بے خلش ہا زیستن نازیستن — باید آتش در تہِ پا زیستن
زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است — از ہمیں تقدیر تغییرِ خودی است
ذرہ از شوقِ بے حد رشکِ مہر — گنجد اندر سینۂ اُو نہ سپہر

شوق چوں بر عالمے شبخوں زند
آنیاں را جاودانی می کُند

(ترجمہ: وہ آزاد مرد جو اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہے اُس کی روح بہشت میں نہیں سماتی۔ مُلّا کی جنت شراب، حور اور غلام ہیں۔ آزادوں کی جنت سیرِ دوام ہے۔ مُلّا کی جنت کھانا سونا

اور گانا ہے۔ عاشق کی جنت وجود کا تماشا ہے۔ مُلّا کا حشر قبر کا شق ہونا اور بانگِ صُور ہے۔ عشق شور انگیز خود صبح نشور ہے۔ علم خوف اور رجائیت پر بنیاد رکھتا ہے اور اس کے برعکس عشق کو اُمید اور ہراس سے کوئی سروکار نہیں۔ علم کائنات کے جلال سے ڈرتا ہے جبکہ عشق کائنات کے جمال میں غرق ہوتا ہے۔ علم کی نظر گذشتہ چیزوں اور دورِ حاضر پر ہے جبکہ عشق آئندہ آنے والے واقعات کو دیکھتا ہے۔ عشق آزاد، غیور اور نا صبور ہوتا ہے اور وجود کے نظارے کی جسارت کرتا ہے۔ ہمارا عشق شکوؤں سے بیگانہ ہے اگرچہ یہ اُس کے لئے ایک گریۂ مستانہ ہے۔ بغیر خلش کے جینا اور نہ جینا برابر ہے۔ جینا اِس طرح چاہیئے کہ گویا پاؤں کے نیچے آگ ہو۔ اس طرح جینا خودی کی تقدیر ہے اور اسی تقدیر سے خودی کی تعمیر ہے۔ ایک ذرہ جس میں بے حد شوق موجود ہو وہ سورج کے لئے بھی باعثِ رشک ہے اُس کے سینے میں نو آسمان سما جاتے ہیں۔ شوق جب دنیا پر شب خون مارتا ہے تو فانی لوگوں کو حیاتِ جاوداں بخش دیتا ہے)۔

ملک و ملت سے غداری کرنے والوں سے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے وجود کو دوزخ بھی قبول کرنے سے اِنکار کرتا ہے۔ ایسے اشخاص ملک و ملت کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں اور اُن کے جسم میں ہزاروں فتنے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شہید آزادیٔ ملک و ملت کے لئے حیاتِ جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کی موت میں اسلام دوبارہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور ملت دوبارہ اپنے عظیم تر مقاصد کی تکمیل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم، ننگِ دیں ننگِ وطن

ناقبول و نا اُمید و نامراد ملتے از کارشاں اندر فساد

ملتے کو بندِ ہر ملت کشاد ملک و دینش از مقامِ خود فتاد

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیزِ خاطرِ صاحبدلاں
خطۂ ہر جلوہ اَش گیتی فروز — در میاں خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت؟ — ایں ہمہ کردار آں ارواحِ زشت

"در فضائے نیلگوں یک دم بایست
تا مکافاتِ عمل بینی کہ چیست!"

بگذر از مرگے کہ سازد بالحد — زاں کہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
مردِ مومن خواہد از یزداں پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ! انتہائے راہِ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست — ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

(ترجمہ: جعفر بنگال سے اور صادق دکن سے، ننگِ آدم، ننگِ دین اور ننگِ وطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ناقبول، نا اُمید اور نامراد ہیں۔ ایک پوری قوم اُن کے کام کی وجہ سے فساد میں ہے۔ ایک ایسی قوم جس نے ہر قوم کے بندھنوں کو توڑ دیا، اُس کا ملک اور دین اپنے مقام سے گر گیا۔ تو ہندوستان کے خطہ کو نہیں جانتا۔ وہ صاحبدلوں کے

دل کا عزیز۔ وہ خطہ جس کا ہر جلوہ دنیا کی رونق دو بالا کرنے والا ہے ابھی تک خاک و خون میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اس کی مٹی میں غلامی کا بیج کس نے بویا۔ یہ سب اُن ناپاک روحوں کی کارستانی ہے۔ اس نیلی فضا میں ایک لمحہ ٹھہرنا چاہیئے کہ معلوم ہو عمل کا بدلہ کیا ملتا ہے۔

اس موت سے گزر جو قبر سے بناہ پیدا کرتی ہے کیونکہ ایسی موت تو جانوروں کی موت کے برابر ہے۔ مردِ مومن تو یزدانِ پاک سے وہ دوسری موت چاہتا ہے جو اُسے خاک سے اُٹھا دیتی ہے۔ وہ دوسری موت راہِ شوق کی انتہا ہے اور شوق کی جنگاہ میں آخری تکبیر ہے۔ اگرچہ مومن کے لئے ہر موت شکر ہے لیکن ابنِ مرتضیٰ کی موت ایک دوسری چیز ہے۔ شاہانِ جہاں کی جنگ غارتگری ہے لیکن مومن کی جنگ پیغمبری کی سُنّت ہے۔ مومن کی جنگ کیا ہے؟ دوست کی جانب ہجرت ہے۔ اس عالم کو ترک کرنا اور دوست کے کوچے کو اپنانا ہے۔ وہ کہ جس نے شوق کا حرف قوموں سے کہا۔ اُنھوں نے جنگ کو اسلام کی رہبانی کا نام دیا۔ سوائے شہید کے کوئی اس نکتہ کو نہیں جانتا جس نے کہ خود اپنے خون سے اس نکتہ کو خریدا۔)

اسلامی روایات

اقبالؒ نے اپنی تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں اپنے پُرسوز اور دلکش انداز میں اُن اسلامی روایات کی نشاندہی کی ہے جن کو اپنا کر ملّتِ اسلامیہ فلک کی پہنائیوں تک جا پہنچی اور افراد کے اُس کردار و عمل کو عیاں کیا جس کی بدولت اُنھوں نے اپنی انفرادی کامیابیوں کے علاوہ اپنی قوم کو اوجِ ثریا تک پہنچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے آجکل کی مسلم اقوام کی بے حسی پہ خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اُنھیں شرم دلائی ہے۔ اُنھیں ان کی پستی پر بے حجابانہ طریقہ پر لعن طعن کر کے اُنھیں غیرت دلائی ہے کہ وہ مسلمان ہونے کا بھرم رکھ لیں اور اپنے اسلاف کی گذشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُنہی اسلامی روایات اور اسی کردار و عمل کا مظاہرہ کریں جس کے باعث اسلامی دُنیا تہذیب و ترقی اور انسانیت کی آبرو بن گئی تھی۔

اقبالؒ کی زندگی میں اسلامی دنیا اور خصوصاً اسلامیانِ ہند غلامی کے قعرِ گمنامی میں

ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہندوستان میں شوکتِ تیموری کا چراغ بجھ چکا تھا اور مسلمِ ہندی کی سطوت و عظمت پارا پارا ہو چکی تھی۔ ترک عثمانی جس سے اسلامی دنیا کا جذباتی لگاؤ اب بھی باقی تھا، فرنگی سازشوں کی نذر ہو کر وا ماندہ و متزلزل تھا۔ دنیائے عرب تو پہلے اپنے دورِ جہالتِ ثانی میں پہنچ چکی تھی۔ مصری اور ترکستانی بھی محض اپنی عظمتِ رفتہ کا نشان بن کر رہ گئے تھے۔ غرض زیاں ہی زیاں تھا اور افسوس تو یہ ہے کہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ مسلمانِ عالم کو غیرت دلاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق؟ — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار — کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں سے — نے گرمیِ انکار، نہ اندیشۂ بیباک!
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی — جس آنکھ کے پردوں میں نہیں سے نگہِ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانیٔ و مُلّائیٔ و پیری

غلامی کی لعنت ایسی لعنت ہے کہ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ یہ تو سبھی پر واضح ہو گا کہ غلامی ایسا دوزخ ہے کہ کیا اصلی دوزخ اس کا مقابلہ کر سکتا ہو گا۔؟ لیکن جس پیرائے میں انھوں نے اس لطیف نکتے کی وضاحت کی ہے وہ خود انہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

قبر — (اپنے مردہ سے)

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر — تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک

الحذر محکوم کی میّت سے سو بار الحذر اے سرافیل اِلے خدائے کائنات اِلے جانِ پاک

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

اسی کتاب میں ایک اور جگہ غلامی اور دوزخ کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
" نداند آں غلام احوالِ خود را کہ دوزخ را مقامے دیگرے گفت

(ترجمہ: دوزخ سے متعلق ایک واعظِ کافر گر (کافر بنانے والا واعظ) نے کوئی بات کہی۔ لیکن اس بات سے بہتر بات خود کافر نے کہی اور وہ یہ تھی کہ وہ غلام اپنے احوال کو نہیں پہچانتا جو کہتا ہے کہ دوزخ (غلامی کے علاوہ) کوئی اور مقام ہے)

کس زبردست طریقے سے غلامی کا بھانڈا پھوڑا ہے اور ملتِ اسلامیہ کو غلامی کی قید و بند سے آزاد ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس رباعی میں ایک زبردست لطیف نکتہ قابلِ غور یہ ہے کہ واعظ کو کافر گر کہا ہے۔ جیسے اکثر وبیشتر ملکوں کی سیاست میں بادشاہ گروں کے بارے میں سُنا جاتا ہے اسی نسبت سے واعظ پر کافر گر ہونے کی چوٹ کرنا اقبال کا ہی حصّہ ہے۔ وہ بجا طور پر یہ تصور کرتے ہیں کہ ہمارے واعظ قرآن کی جس طرح پر تفسیر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس سے مسلمانوں کا کردار و عمل بیدار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس دُنیا کی محرومیوں کو اگلی دنیا کی بہشت کی آسائشی فراوانیوں کے اسباب ہی بتا کر اور مسلمانوں کو اپنی تقدیر کے چکر میں محو کر کے خوابِ خرگوش میں سُلا کر ہی دم لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے

واعظ و ملاّ اور صوفی صحیح معنوں میں مسلمان اور مومن تو پیدا کر ہی نہیں سکتے جن کی ہیبت سے کوہ بھی رائی بن جائیں البتہ ان سے کافروں کی ایک فوج ظفر موج تو ضرور تیار ہو جائے گی۔ جو کہلانے کو مسلمان ہوں گے لیکن ان میں صفات جملہ کافرانہ ہوں گی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

زمن بر صوفی و مُلاّ سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند مارا

دلے تاویلِ شاں درحیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(ترجمہ: میری طرف سے صوفی و مُلاّ کو سلام پہنچے کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہمیں سُنایا۔ لیکن جو تفسیر قرآن اُنھوں نے بیان کی ہے اُس سے تو اللہ تعالیٰ، جبرئیل اور آنحضرت صلعم بھی حیرت و استعجاب میں ہیں)

ایک اور جگہ اس حالت زار کا ماتم کرتے ہیں کہ ہم قرآن حکیم کی روح کو چھوڑ چکے ہیں اور اس کی حکمت سے استفادہ کرنے کی بجائے بیہودہ توہمات میں پڑ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

نہ بندِ صوفی و ملاّ اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری

بآیاتش ترا کارے جُزایں نیست — کہ از یٰسین اُو آساں بمیری

(ترجمہ: تو صوفی و مُلاّ کی قید میں گرفتار ہو چکا ہے اور تو قرآن کی حکمت سے زندگی کی توانائی حاصل نہیں کرتا۔ قرآن کی آیتوں سے تجھے سوائے اس کے اور کوئی سروکار نہیں کہ اس کی سورتِ یٰسین کے طفیل تو آسانی سے مر سکے)

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست

تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

(ترجمہ: برہمن نے اپنے طاق کو بتوں سے سجایا اور تو نے قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا)

اسی سلسلے میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں سہ

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز ‏ ‏ دگرگوں گشتہ از خویش بگریز

ترازوے بنہ کردارِ خود را ‏ ‏ قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

(ترجمہ: اپنے سامنے قرآن کی اصلی تعلیمات کا (مُلّا کا نہیں) آئینہ لٹکالے۔ تو بدراہ ہوچکا ہے۔ اپنی صفات سے بھاگ۔ تو اپنے کردار کا خود محاسبہ کر اور آنے والی قیامتوں کو بدل ڈال)۔

علامہ اقبالؒ نے خانقاہیت، رہبانیت اور مزارپرستی کی بہت سخت مذمت کی ہے اور ہماری مذموم حالت اور پستی کی انتہا کی بہت بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ اسلام ہمیں ہرگز نہیں سکھاتا کہ ہم دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تگ ودو کرنے کی بجائے اپنے رستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی بجائے اور ترقی کے زینے پر تب وتاب سے آگے بڑھنے کی بجائے دنیا کی تلخ حقیقتوں سے فرار اختیار کریں اور دنیا کو تیاگ کر رہبانیت اور خانقاہیت میں گوشہ عافیت ڈھونڈیں۔ یہ تو محکوم اور پسماندہ قوموں کا ہی خاصہ ہے۔ اسی طرح وہ مجاور جو کسی مزار پر بیٹھ کر اُس بزرگ کی صحیح تعلیمات کا پرچار کرنے کی بجائے اور اُس مزار کے طفیل کسی سکول یا ہسپتال یا اسی قسم کا رفاہِ عامہ کا کام کرنے کی بجائے (جیساکہ دورِ حاضر میں عیسائی مشنریوں کا دستور ہے) اُس مزار کو روزی کمانے کا ہی ایک ذریعہ بنالیتے ہیں اور وہاں رقص وسرود کی محفلیں گرم کرنے ہی کو عین اسلام سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر مسلمان قوم کی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

مریدے خودشناسے پختہ کارے ‏ ‏ بہ پیرے گفت حرفے نیش دارے

بہ برگِ ناتمامے جاں سپردن ‏ ‏ گرفتن روزی از خاکِ مزارے

(ایک اپنے آپ کو پہچاننے والے اور پختہ کار مرید نے اپنے پیر سے کیا دکھتی ہوئی بات کہی کہ کسی مزار کی خاک سے روزی حاصل کرنا اپنے آپ کو ایک لامتناہی موت کے سپرد کرنے کے برابر ہے)

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کا منظر دکھاتے ہوئے ابلیس کی تقریر کے دوران اس سلسلے میں اس کی خواہشات کا کس خوبی سے نقشہ کھینچا ہے ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک نہ ہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوّف اُس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اُس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اُس اُمّت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

پسماندہ قوموں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ تقدیر پرستی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اُن کے افراد اپنی ہمتوں اور عمل پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ تقدیر کے جاگنے ہی کے منتظر رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ فی سبیل اللہ اُنھیں اس دنیا کی دولت میں سے کچھ بخش دے۔ یہ تقدیر پرستی ایسی افیون ہے جس کے نشے نے عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ عام ملاحظے کی بات ہے کہ معاشرہ میں ہمارے افراد، کیا بڈھے بوڑھے، کیا جوان اور کیا عورتیں اور بچے سبھی مقدّر کے صدقے اپنے حصّے کا انتظار کرتے ہیں۔ اور تو اور حد تو یہ ہے کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ بھی مقدّر اور ستاروں کی گردش میں ہی اپنی کامیابی ڈھونڈتے ہیں۔ خدا کرے اس قوم کے افراد جلد یہ محسوس کر سکیں کہ اُن کی تقدیریں اُن کے جنم سے بھی پہلے لکھی نہیں جا چکیں بلکہ خود اُن کا عمل ہی ان کی تقدیر ہے۔ اگر وہ باعمل ہوں گے اور بلند جذبے کے حامل ہوں گے تو اُن کی تقدیر کا ستارا بھی اونچا ہوگا اور اگر وہ بے عمل ہوں گے اور دوں ہمتی اُن کا خاصہ ہوگی تو اُن کی تقدیر بھی مردہ ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کے کلام سے اس سلسلے میں اقتباسات سُنئے ؎

خدا آں ملّتے را سروری داد کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت

بہ آں ملّت سروکارے ندارد — کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

(ترجمہ: خدا نے اُس قوم کو بادشاہت دی جس نے اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اُس نے ایسی قوم سے کوئی سروکار نہ رکھا جس کے دہقان نے دوسروں کے لئے کاشتکاری کی۔)

بہ روما گفت با من راہبِ پیر — کہ دارم نکتۂ از من فراگیر
کُند ہر قوم پیدا مرگ خود را — ترا تقدیر و مارا کُشت تدبیر

(ترجمہ: ایک بوڑھے راہب نے مجھ سے شہرِ روم میں کہا کہ میں ایک پتے کی بات کہتا ہوں مجھ سے سُن لے کہ ہر قوم خود ہی اپنی موت کو پیدا کرتی ہے۔ تجھے تقدیر نے اور مجھے تدبیر نے مار دیا۔)

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(ترجمہ: ایک بہشت حرم کے پاکبازوں کے لئے ہے اور ایک بہشت ہمت والے لوگوں کے لئے ہے۔ ہندی مسلمان سے کہہ دو کہ خوش رہے کیونکہ ایک بہشت فی سبیل اللہ بھی ہے)

ابلیس

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اُس کی آتشِ سوزاں کو سرد — جس کے ہنگاموں میں ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند — کون کر سکتا ہے اُس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

خبر نہیں کیا ہے نام اُس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رُلایا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

علامہ اقبالؒ نے خودی اور خود آگاہی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ خودی کو اُنھوں نے ایک تو خودداری کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور مردِ مسلمان کو چاہیئے کہ خواہ مخواہ، چھوٹی موٹی چیز کے لئے غیروں کے سامنے خواہ مخواہ حقیر نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے خودی کا لفظ خود اعتمادی اور خود آگاہی کے معنوں میں، ہم سمجھتے ہیں کہ کافی زیادہ استعمال کیا ہے۔ یعنی مسلمان کو چاہیئے کہ خود اپنی کوششوں اور صلاحیتوں پر اعتماد رکھے۔ خواہ مخواہ کے احساس کمتری کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ اپنے آپ کو پہچانتے ہوئے اونچے سے اونچا مقصدِ حیات اپنے سامنے رکھے اور اُسے حاصل کرنے کے لئے بھرپور کوشش کرے۔ اللہ تعالےٰ نے ہر فرد کو چاہے وہ مغرب کا باشندہ ہو یا مشرق کا، صلاحیتوں اور قوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ودیعت کیا ہوتا ہے۔ اگر ہم ان کو اپنے عزمِ صمیم اور محنت سے بروئے کار لائیں تو وہ اور بھی اُجاگر ہو جاتی

ہیں اور راستے کی ہر مشکل کو تنکے کی طرح بہا کر لے جاتی ہیں۔ البتہ اگر ہم اُنھیں کام میں لانے سے گریز کریں تو ظاہر ہے کہ وہ صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ خودی بمعنی خودداری اور خودی بمعنی خود اعتمادی اور خود آگاہی کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے کلام سے اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات　　کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا　　ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم　　خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

خودی مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال　　کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا قائل نہیں ہوں میں لیکن　　قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے　　وَرائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر　　کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر　　مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

چو قومے در گذشت از گفتگو ہا　　زِ خاکِ او بروید آرزو ہا
خودی از آرزو شمشیر گردد　　دمِ او رنگ ہا بُرّد زِ بُو ہا

(ترجمہ: جب کوئی قوم محض گفتگو سے دورِ سے آگے نکل جاتی ہے (یعنی عمل کے دور میں داخل ہوجاتی ہے) تو اُس کی خاک سے آرزوئیں اُگتی ہیں۔ خودی آرزو کے باعث شمشیر بن جاتی ہے اور اُس کا دھارا رنگوں کو خوشبوؤں سے کاٹ دیتا ہے۔)

دلے چوں صحبتِ گِل می پذیرد   ہمانِدم لذّتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں "من" آفریند   چو "من" محکومِ تن گردد بمیرد

(ترجمہ: جب دل مٹی کی صحبت اختیار کرلیتا ہے تو اُسی کی طرح خوابیدگی کی لذت حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن جب اُس میں "اپنا پن" بیدار ہوجاتا ہے تو وہ تخلیقات کا حامل ہوجاتا ہے اور جب اُس کا "اپنا پن" جسم کا محکوم ہوجاتا ہے تو وہ مرجاتا ہے)

مشکل پسندی

اقبالؒ نے اپنی تصانیف میں اور خصوصاً "بالِ جبریل" میں اپنی مشکل پسند طبیعت کا برملا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ قوم کو سخت کوشی اور زیرکی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرنے اور اُن پر قابو پانے کی تلقین کی ہے۔ اس جگہ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اقبالؒ نے جہاں جہاں قوم کو بحیثیتِ مجموعی اور فرداً فرداً یہ دعا دی ہے کہ ان کی مشکلات کبھی ختم نہ ہوں تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ وہ قوم کا بھلا نہیں چاہتے یا یہ کہ وہ قوم کی راہ میں مشکلات کے کانٹے بونا چاہتے ہیں بلکہ اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم ترقی کی راہ کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور ہمت ہار جانے کی بجائے اُن پر قابو پانے کی ہر ممکن ترکیب اپنی بلند ہمتی اور سخت کوشی کی عادات کو بروئے لاتے ہوئے آزمائیں اور اس طرح اُن پر قابو پاتے ہوئے ترقی کے راستے پر متواتر چلتے ہی رہیں۔ یعنی ترقی کے راستے کا ایک زینہ طے کر کے یہ نہ سمجھیں کہ ہم منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں بلکہ مردانہ وار آگے بڑھتے ہوئے

بہتر سے بہتر منزل کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ اِسی طرح جہاں اُنھوں نے بار بار کوشش ناتمام کو سراہا ہے اُس سے یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ایسی کوشش جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے یا جس سے مقصد حل نہ ہو وہی اچھی کوشش ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوشش مسلسل جاری رہنی چاہیئے۔ پہلے تو ہم ایک اونچے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پُوری کوشش کریں لیکن اُس مقصد کے حصُول کے بعد یہ کافی نہیں کہ ہم مطمئن ہوکر بیٹھ رہیں اور مزید کوششیں ختم کر دیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ایک اونچے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ہم اُس سے بھی زیادہ اونچا مقصد حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھ لیں اور اس کے لئے اپنی کوشش تیز تر کر دیں۔ اسی طرح جب یہ مقصد بھی حاصل ہو جائے تو پھر اس سے بھی زیادہ اونچے مقصد کے حصُول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ تو یہ ہے "کوشش ناتمام" جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے دعا کی ہے کہ یہ مقصد ہماری قوم اور ہمارے افراد کے سامنے ہمیشہ رہے۔ یعنی ہم زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں راستے کی ہر مشکل پر قابو پانے کے لئے ایک جہد مسلسل کی توفیق عنایت کرے ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — اُنھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

کر مجھ کو پہلے زندگیِ جاوداں عطا — پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

علامہ اقبالؒ نے اکثر و بیشتر جگہ قوم کو اُس کی طویل غلامی، بے حسی اور بے غیرتی پر سخت سُست کہا ہے اس سے بھی اُن کی مراد یہ ہے کہ ہماری غیرت جوش مارے اور ہم خوابِ خرگوش سے بیدار ہو کر غلامی کا طوق اپنی گردن سے اُتار پھینکیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری حوصلہ شکنی ہو یا اُن کے نزدیک ہم اتنے حقیر ہیں کہ ترقی کے قابل ہی نہیں ؎

حاضر ہوا میں شیخِ مجدد کی لحد پہ وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو آنکھیں مری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس سے پیدا کُلہِ فقر سے ہو طُرّۂ دستار
باقی کُلہِ حق ہی سے تھا دولۂ حق طُرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار

اسی کے ساتھ علامہ اقبالؒ نے اکثر و بیشتر جگہ یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ ہر کمالے را زوالے و ہر زوالے را کمالے۔ اگر ہم آجکل زوال کے اتھاہ غار میں گرے ہوئے ہیں تو اس سے نا اُمید و مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر ہم خرد کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کی تمام قوتوں کو بروئے کار لائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم زوال کی منزل کے بعد قدرتی طور پر عروج کی منزل کی طرف دوبارہ پُرعزم طریقے پر روانہ نہ ہو جائیں۔ اُنھوں نے یہ حقیقت بھی بار بار آشکار کی ہے کہ ہر نئی تعمیر سے پہلے پُرانی عمارت کی مکمل تخریب ضروری ہے۔ اور یہی فطرت کا اصول ہے۔ لہٰذا اگر ہم تخریب مکمل تک جا پہنچے ہیں تو اس سے نا اُمیدی اور یاس کی بھی انتہا اپنے اوپر طاری کر لینے کی ہرگز ضرورت نہیں بلکہ پُرعزم طریقے پر تعمیرِ نو کے لیے پوری محنت کے ساتھ کام میں لگ جانا چاہیے ؎

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبحگاہ میں ہے

مہ و ستارہ سے بھی آگے مقام حاصل کرنے کے لئے ہی علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن بننے کی تلقین کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بھی پابند ہیں لیکن دراصل کافر ہیں چونکہ یہ رسوم تو ہم صرف دکھاوے کے لئے ادا کر دیتے ہیں۔ اُن کے ذریعے دی گئی تعلیمات کو ہم یکسر بھول چکے ہیں اور عمل کے نقطۂ نظر سے ہم کافروں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اسلام تو ایک انقلابی اور متحرک مذہب ہے اور قدم قدم پر عمل کی تلقین کرتا ہے لیکن ہم ہیں کہ صرف قرآن کو آرائش یا زیادہ سے زیادہ اس کی تلاوت (بغیر ترجمہ کے) پر اکتفا کرتے ہیں جبکہ اس پر طرہ یہ کہ ہمارے بعض مفسرین اس کی من مانی تفسیریں پیش کرتے ہیں۔ مومن مسلمان اور کافر مسلمان کا فرق واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں :-

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

علامہ اقبالؒ کا مردِ مومن" وہ جملہ اوصاف اپنے آپ میں رکھتا ہے جن کی تلقین انھوں نے اپنی تصانیف میں کی ہے۔ ان سب اوصاف میں سب سے زیادہ علامہ اقبالؒ نے خودی پر زور دیا ہے جس سے زیادہ تر اُن کی مراد خود اعتمادی اور اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کا وصف ہے۔ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ پے در پے ناکامیوں اور مختلف محاذوں پر شکستوں کے بعد ہم اس قدر پست ہمت اور دل برداشتہ ہو چکے ہیں کہ ہم اپنے آپ پر سے مکمل طور پر اعتماد کھو چکے ہیں اور یہ فرض کر چکے ہیں کہ ہم میں کسی بھی بلند مقصد کام کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ گذشتہ ناکامیوں سے بددل ہونا تو کفر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ہمارے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے بار بار خودی کو بیدار کرنے پر زور دیا ہے اور ہمیں یاد دلایا ہے کہ اگر ہم اپنے آپ کو بھول نہ جائیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کمر ہمت کو باندھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بلند سے بلند مقصد کو بھی اپنے دامِ گرفت میں نہ پائیں ۵

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اِسی سے تری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں
تو آ بجھو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ فقر کے وصف پر بھی زور دیا ہے۔ بعض نئے نئے پڑھنے والے علامہ اقبالؒ کے کلام کا جب تک عمیق مطالعہ نہ کریں غلط مطلب اخذ کر لیتے ہیں مثلاً فقر سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی گدائی کا کاسہ لے کر فقیری یعنی گداگری کا پیشہ یا خانقاہیت اختیار کرلے بلکہ فقر سے یہ مراد ہے کہ اُس میں استغنا ہو، وہ خواہ مخواہ "خدمتِ سرکار" کے نشے میں مست نہ ہو اور علامہ اقبالؒ کے زمانے میں تو ہم تھے بھی غیروں کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے۔ سو ہمیں اُنھوں نے اُکسایا کہ ہم حکمرانوں کے کاسہ لیس نہ بنیں بلکہ اپنی عزت و حمیت قائم رکھتے ہوئے اپنی محنت، اپنی حمیت اور اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے میدانِ عمل میں آجائیں اور اپنے راستے کی رکاوٹوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتے ہوئے لے جائیں۔ غیر ملکی حکمرانوں کے بعد بھی "خدمتِ سرکار" کا نشہ کسی طرح جائے نہیں۔ اگر کوئی شخص سرکار کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کی عزت اعمال کی وجہ سے ہونی چاہیے۔ اگر وہ قابلیت اور ذمہ داری سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہا ہے تو اُس کی عزت لازمی طور پر

خود بخود پیدا ہو گی۔ لیکن اگر کوئی حاکمِ اعلیٰ اپنے عہدے کا سزاوار نہیں اور قوم کی خدمت، جو اُس کا صحیح اور اصلی منصب ہے، پوری اہلیت سے نہیں کر سکا تو خواہ مخواہ "خدمتِ سرکار" کے نشہ میں اُس کی خوشامد اور کاسہ لیسی کرنا پوری قوم کے ساتھ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قوم میں باوجود اقبالؒ کی اس قدر سرکھپائی کے ابھی تک اتنا شعور پیدا نہیں ہو سکا کہ ہم صحیح قسم کے حاکم کی عزت کریں اور غلط قسم کے حاکم کو تنقید کا نشانہ بنا سکیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نہایت کروفر اور شان سے رہنے والے حاکموں کی تو خوب عزت کی جاتی ہے بغیر اس چیز کو پہچانے ہوئے کہ ان کی یہ کروفر اور شان کن ذرائع سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے برعکس محنتی اور دیانتدار حاکموں کی صرف اس وجہ سے عزت نہیں کی جاتی کہ وہ سادہ اور اسلامی طریقہ پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اپنے ذرائع پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اگر عوام میں اتنا شعور ہو کہ جھوٹی شان رکھنے والے بددیانت نمائندوں اور حاکموں کو ناپسند کریں اور انھیں برملا نشانۂ تنقید بنائیں اور محنتی اور دیانتدار شخصیتوں کو یہ کہنے کی بجائے کہ وہ افسرانِ اعلیٰ معلوم ہی نہیں ہوتے، اگر تعریف و ستائش سے یاد کریں تو آئندہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کی خواہش کے مطابق ہی اُنھیں نمائندے اور حاکم ملیں گے۔ پس فقر سے مراد گداگری یا خانقاہی نہیں بلکہ استغنا اور "خدمتِ سرکار" کے نشے سے مبرا ہونا ہے۔ اپنے بلند مرتبہ کام میں ہمہ تن مصروف رہنا اور زیرکی کے ذریعے اپنے مقصد کو پا لینے کا نام فقر ہے ؎

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اِک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اِک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اِک فقر ہے شبیریؓ اِک فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

علامہ اقبالؒ انقلاب کے علمبردار تھے۔ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُسی رو میں بہنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ زمانے کے ساتھ برسرِ پیکار ہو کر اُس کی اصلاح کے درپے تھے۔ اُن کے انقلاب کا پیغام مختلف انواع کا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انگریز اس برصغیر پر تقریباً دو صدیوں سے مسلط تھا اور استحصال اور جبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہماری قوم اتنی بے حس تھی کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کے لئے کسی طرح کوشاں نظر نہ آتی تھی چنانچہ اُنھوں نے انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا درس دیا اور اس طرح ہمیں انقلاب کے لئے تیار کیا۔ اس کے علاوہ قوم کو سرمایہ داری، جاگیرداری اور دیگر مخصوص مفادات کی غلامی سے بھی نجات دلانا چاہتے تھے چنانچہ اُنھوں نے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے مہلک اثر کو بھی واشگاف الفاظ میں واضح کیا اور قوم کو بتایا کہ ایسے غیر ملکی حاکموں کی غلامی سے کسی طرح کم نہیں اور جب تک ہم اس غلامی سے بھی آزادی حاصل نہیں کر لیتے ہماری فلاح ممکن نہیں۔ اپنی مشہور نظم "ساقی نامہ" میں فرماتے ہیں ؎

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات — وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرمجوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں آگ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
مرا دل مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لُٹا دے اِسے
لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اِسے

فلسفۂ خودی

علامہ اقبالؒ اُس عہد میں پیدا ہوئے جب اُن کا ملک اور اُن کی ہم مذہب اقوام یعنی اُن کا جملہ گردوپیش غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور پستی کی انتہا اُن کا مقدر بن چکی تھی۔ مشرقی اقوام عالم فرنگ کے ہاتھوں پے درپے شکستوں کے بعد اپنی گذشتہ عظمت و شوکت مکمل طور پر کھو چکی تھیں۔ کیا عرب، کیا ترک۔ کیا ایرانی اور کیا ہندوستانی مسلمان سبھی زوال کی داستان پیش کرتے تھے۔ کہاں وہ زمانہ تھا کہ اسلامی سلطنتیں ایشیا یورپ اور افریقہ میں دُور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کی علم و عرفان کے میدان میں ترقیاں اُنہیں اوجِ ثریا تک پہنچا رہی تھیں اور کہاں یہ زمانہ تھا کہ نہ صرف اسلامی سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں اور علم و عرفان کی راہیں مسدود تھیں بلکہ مسلمان بھی بحیثیت فرد اپنی عظمت کھو چکا تھا۔ ہر محاذ پر شکست کا سامنا تھا اور ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید مسلمان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے فرنگی استعمار پرستوں کے طلسم کو توڑ کر

اپنی مُردہ سوسائٹی کو زندہ کر سکے۔ احساسِ کمتری کا ہم سب پر اِس قدر غلبہ تھا کہ ہم یہ فرض کئے بیٹھے تھے کہ شاید ہم اپنی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں۔ فرنگی کی تعلیمات نے ہمارے ذہنوں میں یہ چیز اچھی طرح بٹھادی تھی کہ ہمارا شعار محض اُن کی وفاداری اور "خدمتِ سرکار" ہے۔ ہمیں اگر تعلیم حاصل کرنی ہے تو صرف اِس لئے کہ اُن کے دفتروں میں کلرکی کر سکیں۔ زراعت پیشہ اختیار کرنا ہے تو صرف اِس لئے کہ اُن کی فیکٹریوں کے لئے خام مال مہیا کر سکیں اور چھوٹی موٹی تجارت کرنی ہے تو صرف اس لئے کہ انگلستان کی تیار کردہ مصنوعات کے حق میں قصیدے پڑھتے ہوئے اُن کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں۔ ہماری کارگذاری صرف اِس قدر رہ گئی تھی کہ لاف زنی پر تو خوب زور تھا اور فی الواقعہ کارگزاری صفر تھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب بھی جب کہ ہمیں آزادی حاصل کئے تقریباً ربع صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ ہمارا طرزِ عمل یہی ہے۔ بازار میں جائیے اب بھی دُکاندار آپ کو IMPORTED یعنی درآمد شدہ چیز ہی فخریہ پیش کرے گا اور مُلکی مصنوعات کی مذمّت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا چاہے وہ کھیلوں کا سامان ہو یا مُلکی کپڑا ہی کیوں نہ ہو جن کی اعلیٰ قسم مُسلّمہ ہے یعنی وہی غلامانہ ذہنیّت ہے۔ حالانکہ مُلکی مصنوعات کے مقابلے میں درآمد شدہ چیز کی تعریف کرتے ہوئے کسی بھی بیوپاری یا غیر بیوپاری کو انتہائی ندامت اور خفّت محسوس کرنی چاہیئے کیونکہ ایک تو اس طریقے سے وہ اپنے مُلک کو غیر مُلکی مصنوعات کا رسیا بنا کر اپنے مُلک کی مصنوعات کو کم تر ثابت کر رہا ہے۔ دوسرے مُلکی خزانے کو زرِ مبادلہ کی صورت میں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اور پھر ایک بیوپاری تو ہوتا ہی تجارت اور صنعت کا نمائندہ ہے۔ اگر وہ خود ہی اپنی صنعتوں کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف رہے تو پھر مُلکی صنعتیں تو کر چکیں ترقّی۔ اسی طرح کردار و عمل کی بجائے کھوکھلی لاف زنی اب بھی اُتنی ہی ترقّی پذیر ہے جتنی علامہ اقبال کے زمانے میں تھی جس شخص نے فی الواقعہ اپنے دن بھر کا کام خوب محنت سے

کیا ہو اور عملی طور پر وہ اپنے کردار سے مطمئن ہو اُسے لاف زنی کی نہ تو ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی محنتِ شاقہ کے بعد اتنا وقت ہوتا ہے کہ ضائع کرے بلکہ وہ کسی صحت مند کھیل یا مشغلے کی طرف توجہ دے گا تاکہ اُس کی جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ دور ہو۔ اور وہ اگلے دن کی محنتِ شاقہ کے لئے دوبارہ تیار ہو سکے۔ علامہ اقبال نے اپنے گرد و پیش کے یہ حالات دیکھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے مُوذی مرض جس میں قوم مبتلا ہے یہ ہے کہ اُس نے خود اعتمادی اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کی خاصیتوں کو یکسر بُھلا دیا ہے بلکہ وہ یہ مرض کر بیٹھے ہیں کہ خود اُن کا وجود شاید ہے ہی نہیں اور نہ ہی اُن سے کوئی قابلِ ذکر کام ہو سکتا ہے۔ اس مرض کی تشخیص کے بعد اور مشرقی اور مغربی فلسفہ و عُلوم سے بنظرِ غائر استفادہ کرنے کے بعد علامہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ سب سے پہلے قوم میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور اُنہیں بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ہر شخص کو بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ اگر اُنہیں بروئے کار لایا جائے تو ہماری راہ میں بڑی سے بڑی مشکل کی بھی کوئی وقعت نہیں اور ہم ہر میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ مستقل مزاجی، محنتِ شاقہ اور زیرکی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں نہایت تفصیل سے اُنہوں نے فلسفۂ خودی کی تشریح و وضاحت اپنی تصنیف اسرارِ خودی میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں نظامِ عالم کی بنیاد بھی خودی پر ہے اور اس زندگی کا تسلسل خودی کے استحکام کے باعث ہے ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ بُو غیرِ اُو پیداست از اثباتِ اُو
میکشد بازُوئے اُو نیروئے خویش تا شود آگاہ از نیروئے خویش

خانۂ اُو نقشِ صد امروز بست | تا بیارد صبحِ فردائے بدست
شعلہ ہائے اُو صد ابراہیم سوخت | تا چراغِ یک محمد برفروخت
می شود از بہرِ اغراضِ عمل | عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد ـ انگیزد ـ پرَد ـ تابد ـ رَمد | سوزد ـ افروزد ـ کشد ـ میرد ـ دمد
وسعتِ ایّام جولانگاہِ اُو | آسمان موجے ز گردِ راہِ اُو
وانمودن خویش را خوئے خودی است | خُفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

قوتِ خاموش و بیتابِ عمل

از عمل پابندِ اسبابِ عمل

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است | پس بقدرِ اُستواری زندگی است
قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کُند | ہستئ بے مایۂ را گوہر کُند
بادہ از ضعفِ خودی بے پیکر است | پیکرش منّت پذیرِ ساغر است
سبزہ چوں تابِ دَمید از خویش یافت | ہمّتِ او سینۂ گلشن شگافت
شمع ہم خود را بخود زنجیر کرد | خویش را از ذرّہ ہا تعمیر کرد
خود گدازی پیشہ کرد از خود رمید | ہم چو اشک آخر ز چشمِ خود چکید
گر بفطرت پُختہ تر بُودے نگیں | از جراحت ہا بیاسُودے نگیں
می شود سرمایہ دارِ نامِ غیر | دوشِ اُو مجروحِ بارِ نامِ غیر

(ترجمہ: ہستی کا وجود خودی کے آثار کی وجہ سے ہے۔ تو (اس دنیا کی تعمیر) جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، خودی کے رازوں کی وجہ سے ہے۔ جب انسان کی خودی خود اُسے بیدار کر دیتی ہے تو سمجھ بوجھ کی ایک دُنیا کو آشکارا کر دیتی ہے۔ اُس کی ذات میں سینکڑوں جہاں پوشیدہ ہیں۔

اُس کے قائم ہونے سے اُس کے علاوہ سینکڑوں مزید جہاں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اُس کا (یعنی خودی کا) بازو اپنی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی مکمّل طاقت سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اُس کا قلم سینکڑوں آج کے دِنوں میں نقش بھرتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایک (روشن) کل کو اپنے قبضے میں لاتا ہے۔ اُس کے شعلوں نے سینکڑوں ابراہیموں کو جلایا۔ تب کہیں جا کر ایک محمد کے چراغ کو روشن کیا۔ اُس کے عمل کے اغراض کے حُصُول کے لئے ہی عامل، معمول، اسباب اور علّتیں ہوتی ہیں۔ وہ اُٹھتا ہے، برانگیختہ ہوتا ہے۔ اُڑتا ہے۔ تپتا ہے۔ دوڑتا ہے۔ وہ جلتا ہے۔ روشن ہوتا ہے۔ کھینچتا ہے۔ مرتا ہے اور پھر اُگتا ہے۔ (یعنی جہدِ مسلسل کی مختلف صورتیں اُس کے درپیش ہوتی ہیں۔) زمانے کی وسعتیں اُس کی جولانگاہ ہے اور آسمان اُس کے راستے کی گرد کی ایک موج ہیں۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنا خودی کی ایک خصلت ہے اور ہر ذرّے میں خودی کی قوتیں خوابیدہ ہیں۔ عمل کی قوّت خاموش اور بیتاب ہے۔ عمل شروع کر دینے ہی سے عمل کے مقصد کے حصول کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

چونکہ دُنیا کی زندگی خودی کی قوّت کی وجہ سے ہے لہٰذا خودی کے استحکام کے مطابق ہی زندگی کا استحکام ہے۔ قطرے کو جب خودی کی اہمیّت معلوم ہو جاتی ہے تو اُس کی بے مایہ زندگی موتی کی مانند ہو جاتی ہے۔ شراب خودی کی کمزوری کی وجہ سے بغیر جسم کے ہے اور اُسے ساغر کا احسان اٹھانا پڑتا ہے۔ بیج نے جب اُگنے کی طاقت اپنے آپ سے حاصل کی تو اُس کی محنت نے گلشن کے سینے میں شگاف پیدا کر دیا۔ شمع نے بھی جب اپنے آپ پر توجہ مرکوز کی تو ذرّوں سے اپنے آپ کو تعمیر کر لیا۔ جب تو اپنے آپ کو گھلانے کا یعنی پشت کرنے کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور اپنے آپ سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے تو آخر کار آنسو کی طرح آنکھ سے گر پڑتا ہے۔ (یعنی اپنی قدر کھو دیتا ہے)۔ اگر نگینہ اپنی فطرت میں پختہ ہوتا تو عمل جراحت سے اُسے خود

آرام پہنچتا۔ لیکن وہ غیر کے نام کا سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ اور اس کا کندھا غیر کے نام کے بوجھ سے مجروح ہوتا ہے۔)

ترقی و تعمیر کے لئے لازمی ہے کہ مقاصد اپنے سامنے رکھے جائیں اور پھر اُنہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ منصوبہ بندی میں یہی سائنسی اصول ہے کہ (TARGETS) یعنی منزلوں کا تعیّن پہلے کر لیا جائے اور پھر اُن کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کی جائے بغیر مقاصد یا (TARGETS) کا تعیّن کئے ہماری کوششوں میں کوئی سرگرمی پیدا نہ ہوگی اور نہ ہی کسی خاص جانب ہم اپنے شعور کے استعمال کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ البتّہ کوئی بلند مقصد اپنے سامنے رکھ کر اُسے حاصل کرنے میں ہر قسم کی مُستعدی اور شعور کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ علّامہ اقبال نے انہی (TARGETS) اور (ACHIEVEMENTS) یعنی کامیابیوں کے طریقۂ کار پر زور دیا ہے اور زندگی میں بُلند مقاصد مُقرّر کر کے اُن کے حُصول کے لئے کوشش پر زور دیا ہے۔

زندگانی را بقا از مُدعاست — کاروانش را درا از مُدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بُوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنّا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ اُو آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسیٰ اِدراک را
دل زِ سوزِ آرزو گیرد حیات — غیرِ حق میرد چو اُو گیرد حیات
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بیتابے زِ دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند — دفترِ افعال را شیرازہ بند
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ — ماسوے را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسماں بالاترے　　دل رُبائے دل ستانے دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے　　فتنہ در جیبے سراپا محشرے

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

(ترجمہ: زندگی کو مُدعا یعنی تعیّنِ مقاصد ہی سے بقا حاصل ہے اور اُس کے کارواں کو اس سے تیزی نصیب ہے۔ زندگی کا راز جستجو میں پوشیدہ ہے۔ اُس کی اصلیت آرزو میں پوشیدہ ہے۔ ہر چیز کی فطرت آرزو کی امین ہے۔ تمنا سے سینوں میں دل کا رقص ہے اور سینے اُس کی تب وتاب کی وجہ سے آئینوں کی طرح (صاف وشفاف اور روشن ہیں) وہ یعنی تعیّنِ مقاصد خاک کو پرواز کی طاقت عطا کرتا ہے اور عقل کے موسیٰ کے لئے خضر جیسا رہنما ثابت ہوتا ہے۔ آرزو کے سوز سے دِل زندگی حاصل کرتا ہے، جب وہ زندہ ہوتا ہے تو یہ غیرِ حق کی موت ہے۔ آرزو کی وجہ سے خودی کی ہنگامہ آرائی ہے۔ یہ دُنیائے خودی کی ہی ایک بیتاب موج ہے۔ آرزو، مقاصد کے شکار کے لئے ایک کمند کا درجہ رکھتی ہے اور یہ افعال کے دفتر کا شیرازہ اکٹھا کرتی ہے (یعنی قوتوں کو جمع کرکے اور اُنہیں یکسوئی دے کر حصولِ مقصد کی راہ پر ڈالتی ہے)۔ ایسا مقصد جو جسم کی طرح روشن ہو وہ ماسوا کے لئے (یعنی غیر اللہ کے لئے) جلا دینے والی آگ ہے۔ ایک ایسا مقصد جو آسماں سے بھی اُونچا ہو ایک محبوب دِلرُبا کی مانند ہے جو دِل کو کھینچے لئے جاتا ہے۔ یہ یعنی مقصدِ بلند قدیم اور باطل چیزوں کو غارت کر دیتا ہے۔ ہم مقاصد کی تخلیق ہی سے زندہ ہیں اور آرزو کی شعاع ہی سے ہماری چمک دمک ہے)

عشق ومحبت کو علامہ اقبال نے خودی کا استحکام بتایا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ کوئی بھی تعمیراتی منصوبہ اُس کے تحت لازمی طور پر اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کی فلاح وبہبود بھی لازمی

طور پر مُضمر ہو گی لہٰذا اگر دوسروں کی فلاح و بہبود ہمارے پیش نظر رہے گی یعنی اِس سلسلے میں ہم خواہ مخواہ کی کنجوسی سے کام نہ لیں گے تو لازمی طور پر انسانیت کی فلاح کے تعمیراتی منصوبے جنم لیں گے اور انسانیت بحیثیتِ مجموعی ترقی کی طرف قدم بڑھائے گی اور اِسی میں ہمارا اپنا بھی فائدہ ہے۔ کسی بھی پیغمبر، مُصلح یا مخلص سیاسی رہنما کی مثال لے لیجئے اُنہوں نے شبانہ روز کی محنتِ شاقہ اور تکالیفِ اسی لئے برداشت کیں کہ اُن کی اُمتیں اور قومیں آنے والی صدیوں میں امن اور سکون سے رہیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوں۔ اگر اُن کے دِلوں میں اُمتوں اور قوموں کی فلاح کا جذبہ موجزن نہ ہوتا، اگر اُنہیں انسانیت سے عشق و محبت نہ ہوتی تو لازمی طور پر آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ اُو خودی است زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صُلح و ہم پیکارِ عشق آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق
از نگاہِ عشق خارا شق بود عشقِ حق آخر سراپا حق بُود
عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوح و قلبِ ایوبے طلب
در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ اُو محرومِ نوم تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
روزِ محشر اعتبارِ ماست اُو در جہاں ہم پردہ دارِ ماست اُو

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد — مکّہ را پیغامِ لاتثریب داد

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار

اندکے اندر حرائے دل نشیں — ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گام زن — لات و عزّائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق — جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ انّی جاعلٌ سازد ترا

(ترجمہ: اِس نور کا نقطہ کہ جس کا نام خودی ہے۔ ہماری خاک کے نیچے زندگی کی چنگاری ہے۔ یہ محبت سے پائندہ تر ہو جاتی ہے۔ زیادہ زندہ، زیادہ چمک دمک والی اور زیادہ تپش دار ہو جاتی ہے۔ عشق کو تلوار اور خنجر سے کوئی خوف نہیں۔ عشق کی اصلیت پانی، ہوا اور خاک سے نہیں ہے۔ اس دنیا میں عشق کی وجہ سے صُلح بھی اور جنگ بھی ہے۔ زندگی کا چشمہ، عشق کی جوہر دار تلوار ہے۔ عشق کی نگاہ کی وجہ سے پتھر (کا سینہ) شق ہو جاتا ہے۔ عشقِ حق آخر خود بھی سراپا حق ہوتا ہے۔ تو عاشقی سیکھ لے اور کسی محبوب کی تلاش کر۔ تو کبھی نوح کی آنکھ اور کبھی ایوب کا دل طلب کر۔ مسلمانوں کے دل میں مصطفٰے کا مقام ہے۔ ہماری آبرو مصطفٰے کے نام ہی کی وجہ سے ہے۔ بوریا اُس کے خوابِ راحت کا ممنون ہے جس کی وجہ سے کسریٰ کا تاج اُس کی اُمّت کے پاؤں کے نیچے آ رہا۔ اُس نے حرا کی غار میں تنہائی کی راتیں بسر کیں اور اس طرح اُس نے ایک قوم، ایک آئین اور ایک حکومت پیدا کی۔ کئی راتوں تک اُس کی آنکھیں بغیر نیند کے رہیں یہاں تک کہ اُس کی قوم تختِ خسروی پر سوئی۔ محشر کے دن ہمارا اعتبار وہی ہے اور دُنیا میں بھی ہمارا پردہ دار وہی ہے۔ وہ کہ جس نے دشمنوں پر بھی رحمت کا دروازہ کھول دیا اور مکّہ کو "لاتثریب"

کا پیغام دیا۔ اگر تُو عاشق ہے تو تقلیدِ یار (یعنی تقلیدِ مصطفےٰؐ) میں پختگی حاصل کرتا کہ تیری کمند کا شکار خودِ یزداں ہو جائے۔ کچھ عرصہ تُو اپنے دِل کی حِرا میں بیٹھ۔ تو اپنے آپ کو چھوڑ دے اور حق کی طرف ہجرت کر۔ تُو حق سے استحکام حاصل کر اور پھر اپنی طرف آ۔ ہوس کے لات وعُزّیٰ کو سرتا پا توڑ ڈال عشق کی قوّت سے ایک لشکر پیدا کر اور عشق کے فاران کی چوٹی پر جلوہ گر ہو یہاں تک کہ کعبے کا خُدا تجھ پر مہربانی کرے اور تجھے اِنّی جاعِلٌ کا مرتبہ دے یعنی تجھے خلیفۃ الارض بنا دے)

علاّمہ اقبال نے افلاطون کے مشہور فلسفۂ اِعیان کی بہت سخت مذمّت کی ہے چونکہ وہ زندگی کے خشک و تر کا مقابلہ کرنے کی بجائے (ESCAPIST) یعنی زندگی سے فرار کے نظریے کا علمبردار تھا۔ اُس کا فلسفہ قوم کے لئے ایک افیونی کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی میں حرکت وعمل کی بجائے رومانوی سکون کی تلاش کا متمنّی ہے۔ علاّمہ اقبال نے اُسے "گروہِ گوسفندانِ قدیم" کا رُکن بتایا ہے جبکہ خود علاّمہ اقبال نے قوم کو شیروں کی متحرّک اور قوی خصلتوں کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ خود علاّمہ اقبال کے خیال میں ارسطو نے بھی افلاطون کے مشہور مسئلۂ اعیان پر نہایت عمدہ تنقید کی تھی۔ بدقسمتی سے ہم لوگ تو اِتنے بڑے بڑے ناموں کو، جیسا کہ افلاطون کا نام ہے اُس کر خواہ مخواہ متاثر ہو جاتے ہیں اور اُس کے فلسفے کو اور اِسی طرح رومن اُدبا کے فلسفے کو آسمانی صحیفہ سمجھ کر اندھا دُھند تقلید کے درپے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم میں ذرا تنقیدی حِس ہو جیسا کہ اُس مُفکّرِ اعظم، شاعرِ مشرق میں تھی تو ہمیں پتہ چلے کہ افلاطون اور اُس کے دور کا فلسفہ قوم میں شیر کی بجائے بھیڑ بکری کے خصائل پختہ تر کر دے گا۔ اور وہ دن دور نہیں کہ ہم موت کے سکوت ہی کو عین زندگی سمجھنے لگیں۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گُفت سرِ زندگی در مُردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بُود　　جانِ اُو وارفتۂ معدوم بود
مُنکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است　　مُردہ دِل را عالمِ اعیاں خوش است
آہُوَش بے بہرہ از لطفِ خرام　　لذتِ رفتار بر کبکش حرام
راہبِ ما چارہ غیر از رَم نداشت　　طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت
از نشیمن سوئے گردوں پَر کشود　　باز سُوئے آشیاں نامد فرود
قومہا از سُکرِ اُو مسموم گشت　　خُفت واز ذوقِ عمل محروم گشت

(ترجمہ: وہ دیرینہ راہب افلاطون حکیم، قدیم بھیڑوں کے گروہ میں سے تھا۔ اُس نے کہا کہ زندگی کا راز مرجانے میں ہے اور شمع کے سینکڑوں جلوے اُس کے بُجھ جانے میں ہیں۔ وہ ذوقِ عمل سے بہت زیادہ محروم تھا۔ اُس کی جان "معدوم" پر فریفتہ تھی۔ وہ آجکل کے ہنگامے کا مُنکر ہوگیا اور فلسفۂ اَعیاں کا خالق بنا جو غیر محبوب ہے۔ زندہ جان کے لئے تو مُمکنات کی دُنیا خوش آئند ہے لیکن مُردہ دل کے لئے افلاطون کے فلسفۂ اَعیاں کی دُنیا بھلی ہے۔ اُس کا ہرن لطفِ خرام سے بے بہرہ ہے اور اُس کے کبک کے لئے رفتار کی لذّت حرام ہے۔ ہمارے راہب نے فرار کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ دیکھا۔ اُس میں دُنیا کے شور وغوغا کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اُس نے اپنے آشیانے سے آسمان کی طرف اُڑان کی لیکن پھر اپنے آشیانے کی طرف نیچے نہ آیا۔ کتنی ہی قومیں اُس کے بے جان اور بے حرکت فلسفہ کی وجہ سے مُرجھا گئیں۔ وہ سوگئیں اور ذوقِ عمل سے محروم ہوگئیں)

علامہ اقبال نے تربیتِ خودی کے تین مراحل بتائے ہیں یعنی اطاعت (ORGANISA-
-TIONAL DISCIPLINE) ضبطِ نفس (SELF CONTROL) اور نیابتِ الٰہی

پہلے مرحلے یعنی اطاعت (ACTING AS GOD'S DEPUTY ON EARTH) کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اونٹ کی طرح خدمت اور محنت کو شعار بنائیے جو بارِ محمل سے محو ہو کر سرمستی کے عالم میں دِنوں اور ہفتوں کی بھوک پیاس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف سخت دُشوار راہ کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے یعنی ضبطِ نفس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا نفس شُتر بے مہار کی طرح خود پرور، خود پرست اور خود سر ہے ہمیں چاہیئے کہ مردانہ وار اِس پر قابو پائیں اور اِس کی قوّتوں کو تعمیری میدانوں کی طرف استعمال کریں۔ تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی ہے۔ جو اپنے آپ میں خدائی صفات پیدا کرنے کی سعی کے مُترادف ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم اِس دُنیا میں نائبِ حق بننے کی سعی کریں گے تو کتنی قوتیں ہمارے زیرِ نگیں ہو جائیں گی اور ہم نظامِ حیات اور عناصرِ فطرت کو کیسے بآسانی مُسخّر کر سکیں گے ؎

اطاعت

خدمت و محنت شعارِ اُشتر است　　　صبر و استقلال کارِ اُشتر است
گام اُو در راہ کم غوغاستے　　　کارواں را زورقِ صحراستے
نقش پایش قسمتِ ہر بیشۂ　　　کم خور و کم خواب و محنت پیشۂ
مست زیرِ بارِ محمل می رَوَد　　　پائے کوباں سوئے منزل می رود
سرخود از کیفیتِ رفتارِ خویش　　　در سفر صابر تر از اسوارِ خویش
تو ہم از بارِ فرائض سر متاب　　　برخودی از عِندہٗ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　　می شود از صبر پیدا اختیار
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند　　　خویش را زنجیریِ آئین کند

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو | از حدودِ مصطفیٰ بیروں مَرَو

ضبطِ نفس

نفسِ تو مثلِ شتر خودپرور است | خود پرست و خود سوار و خودسر است
مرد شو آور زمامِ او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خذف
ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں | می شود فرماں پذیر از دیگراں
اہلِ قوت شو ز وِردِ یاقوی | تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

نیابتِ الٰہی

گر شتر بانی جہانبانی کُنی | زیبِ سر تاجِ سلیمانی کُنی
نائبِ حق در جہاں بودن خوش است | بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است | ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است

(ترجمہ : اطاعت۔ اونٹ کا شعار خدمت اور محنت ہے اور اُس کا کام صبر و استقلال ہے۔ راہ نوردی کے وقت اُس کے قدموں میں کوئی شور نہیں ہوتا اور وہ کارواں کے لئے صحرا کی کشتی کے مطابق ہے۔ اُس کے پاؤں کا نقش ہر جنگل کی قسمت ہے۔ وہ کم کھاتا ہے کم پیتا ہے۔ اور محنت اُس کا پیشہ ہے۔ وہ محمل کے بوجھ کے نیچے سر مست چلا جاتا ہے اور پاؤں کوٹتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہی رفتار سے سر مست ہوتا ہے اور سفر میں اپنے سوار سے بھی زیادہ صابر ہوتا ہے۔ تو بھی اپنے فرائض کے بوجھ سے سرتابی نہ کر اور عندہٗ حسن المآب سے استفادہ کر۔ اے غفلت شعار تو اطاعت اختیار کر۔ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی

مہر و پرویں کو تسخیر کرتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی آئین کا پابند کرتا ہے۔ تُو آئین کی سختی کا شکوہ نہ کر اور مصطفیٰ کی حُدود سے باہر نہ جا۔

ضبطِ نفس۔ تیرا نفس شتر (بے مہار) کی طرح خود پرور، خود پرست، خود سوار اور خود سَر ہے۔ تُو مَرد بن اور اُس پر قابو پا اور اِسی طرح اگر تو خذف ہے تو گوہر بن جائے گا۔ جو شخص کہ اپنے اُوپر فرماں روائی نہیں کر سکتا وہ دوسروں کا مُطیع ہو جاتا ہے۔ تو درد یا قوی سے قوّت حاصل کرتا کہ تو اپنے نفس کے اُشتر پر قابو پا سکے۔

نیابتِ الٰہی۔ اگر تو شتربان بننے میں کامیاب ہو جائے تو تُو جہاں بانی کرے گا۔ اور سلیمانی کے نام کی زیب و زینت بن جائے گا۔ اِس دنیا میں حق کا نائب بننا بڑی خوش آئند بات ہے۔ اور عناصر پر حُکمرانی کرنا بہت اچھی بات ہے۔ نائبِ حق دُنیا جہان کی جان کی مانند ہے۔ اُس کی ہستی اسمِ اعظم کے سائے کی مانند ہے۔)

فلسفۂ خودی اور تصورِ ملّت

علامہ اقبال نے جہاں اپنے آپ سے پیوست ہوئے اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے اور خود اعتمادی و خودداری پر زور دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بے خودی کا درس بھی دیا ہے۔ اس طرح ان کی متوازن تعلیمات ایک متوازن شخصیت اور قوم کی تعمیر پر منتج ہوتی ہیں بعض لوگ ان کے درسِ خودی سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاید علامہ اقبال نے کبر و نخوت کی تلقین کی ہے یا وہ "ہم چو ما دیگرے نیست" کے فلسفے کو اولیٰ سمجھتے تھے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ اوّل تو خودی سے زیادہ تر ان کی مراد خود اعتمادی اور اپنی قلب و خرد اور نظر کی جملہ صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانا اور ہر مشکل سے مشکل کام کو اپنی جہدِ مسلسل اور زندگی سے زیر کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خودداری یعنی (SELF RESPECT) کا سبق بھی دیا ہے۔ اور دستِ سوال دراز کرنے کی سخت مذمت کی ہے لیکن اس سے ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ کبر و نخوت اختیار کی جائے یا لاف زنی کا رویہ اختیار کئے رکھا جائے۔ اس کے برعکس کبر و نخوت

کی انہوں نے اکثر جگہ مذمت کی ہے اور لاف زنی کو پسماندہ اقوام کا خاصہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ ایسی اقوام جو کردار و عمل سے محروم ہوتی ہیں اور گمنامی اور پسماندگی کے اتھاہ غار سے نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ لاف زنی پر ہی تکیہ کرتی ہیں اور "ہمچو ما دیگرے نیست" ان کا شیوہ ہوتا ہے۔

فرد اور ملت کے پاک رشتے کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی تصنیف "رموزِ بیخودی" میں اس امر پر زور دیا ہے کہ افراد جب تک مکمل طور پر اپنے آپ کو ملت کی وحدت میں ضم نہیں کر دیں گے ملت کا استحکام ممکن نہیں یعنی ملت کے مفادات کا خیال نہ رکھتے ہوئے اگر ہر فرد یا ملک کا ہر طبقہ اور خطہ اگر اپنے اپنے مفادات ہی کو پیشِ نظر رکھے تو ظاہر ہے کہ ملت کو ضعف پہنچے گا اور اسی قسم کا متواتر رویہ بالآخر ملت کے خاتمہ پر منتج ہوگا۔ کچھ اسی قسم کا مسئلہ آج کل ہماری قوم یعنی ملتِ اسلامیۂ پاکستان کو درپیش ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کے مختلف طبقات چاہے وہ سرمایہ دار طبقہ ہو یا مزدور طبقہ سبھی صرف اپنے مفادات کی نگہبانی کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور من حیث القوم یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس صورتِ حال میں پوری قوم کا فائدہ ہے۔ حالت یہ ہے کہ ملازمتوں اور تجارت و صنعت وغیرہ میں ذات پات کی تمیز کچھ اس قدر شدید ہو چکی کہ نہ صرف قومی مفادات کو ان پر قربان کیا جا رہا ہے بلکہ فی الواقعہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں کوئی عار نہیں سمجھا جاتا۔ قوم کا بھلا ہو تو کیونکر ہو۔ ملازمتوں اور تجارت و صنعت کو چھوڑیئے ملک کے مختلف خطوں کو لے لیجیے۔ ہم پنجابی۔ پٹھان سندھی بلوچ اور مہاجر پہلے ہیں اور پاکستانی بعد میں۔ افسوس صد افسوس کہ ہم نے قائدِ اعظم کے ارشادات کو بھلا دیا علامہ اقبال کے افکارِ عالیہ سے منہ موڑ لیا اور صوبہ پرستی اور زبان پرستی کی مکروہ لعنت کو گلے سے لگا لیا افسوس تو اس امر کا ہے کہ اسی عصبیت اور زہر کی وجہ سے ملک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہماری آنکھیں نہیں کھلیں اور ہم سندھی اور غیر سندھی بلوچ اور غیر بلوچ اور اسی

طرز کے دوسرے جھگڑوں میں اس قدر شدت سے گرفتار ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اسپین میں مسلمانوں کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہاں مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی اسپین کے جھگڑوں نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ سات سو سال تک سپین میں حکمرانی کرنے کے بعد انھوں نے علاقہ پرستی اور قبیلہ پرستی کا وہ زہر اپنے اندر سمو دیا اور ایک دوسرے سے ایسا ٹکرائے کہ ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ کمینہ دشمن جو عرصہ سے گھات میں تھا ایسا غالب آیا کہ اب ایک بھی مسلمان اسپین کی سرزمین میں موجود نہیں اور وہاں کی مسجدیں منکروں کی عبادت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ کاش ہم انہیں سے سبق سیکھیں اور اپنے مزید جھگڑے ملّت کی بقا کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت کے نقطۂ نظر سے ختم کر دیں اور ملّت کی وحدت کو اس قدر استحکام بخشیں کہ دشمن کو اپنی حاسدانہ اور کینہ پرور نگاہیں ہماری طرف اُٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ علاّمہ اقبال کی مذکورہ تصنیف سے ربطِ فرد و ملّت کے عنوان پر اقتباس ملاحظہ ہوں ؂

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرزِ جاں کن گفتۂ خیرالبشر — ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملّت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد — شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوّتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گردد اندیش — نرم رو مثلِ صبا گرد اندیش

پا بہ گل مانند شمشادش کُند دست و پا بند و کہ آزادش کُند
چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود آہوئے رَم خوئے او مُشکیں شود

(ترجمہ: فرد کے لئے جماعت کا ربط باعث رحمت ہے اس کے جوہر کے لئے کمال ملّت کی وجہ سے ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ آزادوں کے ہنگامہ کی رونق بنے تو جماعت کے ساتھ وفاکیشی اختیار کر خیر البشر کے کہے ہوئے کو ازبر کرلے اور وہ قول یہ ہے کہ شیطان ہی جماعت سے زیادہ دور رہتا ہے۔ فرد اور قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، جیساکہ ہار اور موتی اور کہکشاں اور ستارہ ہیں۔ فرد کا احترام ملّت کی وجہ سے ہے اور ملّت کا نظام افراد کے باعث۔ جب فرد جماعت کے اندر گم ہوجاتا ہے تو پھیلنے کی خواہش رکھنے والا قطرہ قلزم بن جاتا ہے۔ جس کسی نے ملّت کے چشمے سے پانی نہیں پیا۔ نغمے کے شعلے اس کے بین میں بجھ گئے۔ اکیلا فرد اپنے مقاصد سے غافل ہے اور اس کی قوتیں اس کی آشفتگی کے سامنے حائل ہوتی ہیں۔ قوم کو ضابطے کا پابند کیجئے اور اسے صبا کی طرح نرم رو کیجئے شمشاد کی طرح اس کی بنیاد زمین میں جکڑ دیجئے اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وجہ سے پابند کئے جاتے ہیں کہ وہ آزاد رہ سکے جب وہ حلقۂ آئین کا اسیر ہوجاتا ہے تو اس کی خصلت اُس آوارہ ہرن کو مشکیں بنا دیتی ہے۔)

افراد اگر ملّت کے حلقے میں منظم ہوجائیں تو انہیں ایک ایسے صاحبِ دل اور صاحبِ نظر رہنما کی نعمت حاصل ہوجاتی ہے جو اُنہیں ترقی کی منازل پر نہایت سرعت سے آگے بڑھاتا ہوا ان کے لئے جنت کا سامان پیدا کردیتا ہے۔ افراد کی اکثریت تو خام ہوتی ہے اور اگر ان کو الگ الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ سب کے سب علیحدہ علیحدہ ہرگز اتنی ترقی نہیں کرسکتے کہ ان سب کا مرتبہ اوجِ ثریا تک جا پہنچے لیکن ملّت کی شیرازہ بندی کے بعد ایک تو ان

کے وسائل مجتمع ہو کر بہتر کارکردگی کی صورت پیدا کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اگر اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرے اور کوئی پختہ کار ان کی رہنمائی کیلیے مل جائے اور ظاہر ہے کہ کوئی پختہ کار ہی زیادہ عرصہ تک قوم کی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں سنبھال سکتا ہے، تو وہ مجتمع وسائل ظاہر ہے کہ مکمل طور پر بہتری کی صورت میں بروئے کار لائے جائیں گے سہ

تا خُدا صاحبدلے پیدا کُند　　کو ز حرفے دفترے اِملا کُند
سازِ پردازے کہ از آوازہٗ　　خاک را بخشد حیاتِ تازہٗ
ذرّہٗ بے مایہ متو گیرد ازُو　　ہر متاعِ ارج نو گیرد ازو
زندہ از یک دم دو صد پیکر کُند　　محفلے رنگیں زیک ساغر کند
رشتہ اش کو بر فلک دارد گرے　　پارہائے زندگی را ہمگرے
تازہ انداز نظر پیدا کند　　گلستاں در دشت و در پیدا کند
از تفِ او ملّتے مثلِ سپند　　بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند
نقشِ پایش خاک را مینا کند　　ذرّہ را چشمک زن مینا کُند
عقلِ عریاں را دہد پیرایۂ　　بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ
بندہ ہا از پا کُشاید بندہ را　　از خدا وندان رباید بندہ را

ترجمہ : یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک صاحب دل پیدا کر دیتا ہے جو ایک حرف سے ایک دفتر کے معنی پیدا کرتا ہے وہ ایک ایسا ساز ترتیب دیتا ہے جو خاک کو ایک نئی زندگی عطا کر دیتا ہے حقیر سا ذرّہ اس کی وجہ سے چمک حاصل کرتا ہے اور ہر متاع اس سے ایک نئی بلندی حاصل کرتی ہے وہ ایک سانس سے دو جسم زندہ کر دیتا ہے اور ایک ساغر سے پوری ایک محفل کو رنگین بنا دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا حلقہ ہوتا ہے جس کا ایک سرا آسمان

پر ہوتا ہے اور جو زندگی کو شیرازہ بند کر دیتا ہے۔ وہ ایک تازہ اندازِ نظر پیدا کر دیتا ہے۔ اور جنگل و صحرا میں گلستان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کوششوں سے قوم ایک تیز رفتار گھوڑے کی مانند شور و ہنگامہ بپا کرتی ہوئی مصروفِ عمل ہو جاتی ہے۔ اس کے پاؤں کا نقشِ خاک کو بینائی بخش دیتا ہے اور ذرّہ کو سینا کا ہم پلّہ بنا دیتا ہے وہ عقلِ محض کو ایک معنی عطا کرتا ہے اور اس بے مایہ کو ایک سرمایہ عطا کرتا ہے وہ غلاموں کے پاؤں کی زنجیریں کھول دیتا ہے اور انہیں آقاؤں سے آزادی دلاتا ہے)

ملّت کا تصوّر پیش کرتے ہوئے علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے سب سے پہلا رُکن توحید ہے۔ وہ وطن کی بجائے مذہب اسلام پر ملّت کی اساس رکھتے ہیں اُن کی نظر میں حسب و نسب اور وطنیت کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ مذہبِ اسلام ہی ایک ایسا تصوّر پیش کرتا ہے جس میں مکمل مساوات اور عدل کی ضمانت دی گئی ہے اور جس میں طبقاتی اور علاقائی کشمکش کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے علامہ اقبال نے ہمیشہ خرد کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ قلب کی قوتوں کو بروئے کار لانے پر زور دیا ہے۔ خرد یعنی عقل تو ظاہر ہے کہ بے رحمانہ اور حریصانہ طور پر اپنی ذاتی بھلائی کے لئے ہر قسم کی ذاتی لوٹ کھسوٹ کو جائز گردانے گی جس سے نہایت ہی مذموم قسم کا استحصال وجود میں آئے گا جیسا کہ یورپین اقوام نے دورِ حاضر میں روا رکھا۔ علامہ اقبال نے اکثر فرنگی اقوام کو ان کے اس رویہ کے پیشِ نظر کفن چوروں کے گروہ سے تشبیہ دی ہے۔ قلب کی قوتیں بھی اگر خرد کی قوتوں کے ساتھ ساتھ بیدار ہوں گی تو عدل اور انصاف کے تقاضے کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے کیونکہ دل عشق و محبّت کا منبع ہوتا ہے اور عشق و محبت کبھی ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے دوسروں کا استحصال پسند نہیں کرتا۔ مذہب سے لگاؤ قلب کی قوتوں میں استحکام پیدا کرتا ہے اور مذہب جس نے عدل و مساوات

اور یگانگت پر انتہائی زور دیا ہے اور ہر قسم کی وطنیت علاقائیت اور ذات پات کی تمیز، حُزن و یاس اور خوف کے بتوں کو توڑ کر اور اُن باطل کی قوتوں سے نجات حاصل کرا کے ہمیں توحید کی طرف بلاتا ہے اور اس طرح ہمیں غیر اللہ کے پنجے سے چھڑاتا ہے پس انہوں نے توحید کو ملتِ اسلامیہ کا رکنِ اوّل قرار دیا ہے ؎

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است — ور اُتی الرحمٰن عبداً مضمر است
دیں از و حکمت از و آئیں از و — زور از و، قوت از و تمکیں از و
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد — عاشقاں را بر عمل قدرت دہد
پست اندر سایہ اش گردد بُلند — خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرتِ اُو برگزیند بندہ را — نوعِ دیگر آفریند بندہ را
بیم و شک میرد عمل گیرد حیات — چشم می بینم ضمیرِ کائنات

چوں مقامِ عبدۂ محکم شود
کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است — حکم اُو اندر تن و تن فانی است
ملتِ مارا اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم — پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم
مُدعائے ما مآلِ ما یکیست — طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست

ما ز نعمتہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یکدل و یکجا شدیم

(ترجمہ: اہلِ حق کو توحید کے رمز بادہیں جو اٰتی الرحمٰن عبداً کی آیت میں مضمر ہیں۔ دین اور حکمت اور آئین اسی سے ہیں۔ زور، قوت اور تمکین سب اسی سے ہیں۔ اس کا جلوہ عالموں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور عاشقوں کو یعنی اہلِ قلب کو عمل پر اختیار دے دیتا ہے۔ اس کے سایہ میں پست، بلند ہو جاتے ہیں اور خاک اکسیر کی مانند مبارک ہو جاتی ہے۔ اس کی قدرت بندے کی قدر و منزلت بڑھا دیتی ہے اور اس کے لئے ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہے۔ خوف و شک مٹ جاتا ہے اور عمل کو زندگی ملتی ہے آنکھوں کو کائنات کا ضمیر نظر آتا ہے۔ جب عبدہٗ کا مقام محکم ہو جاتا ہے تو بھکاری کا کاسہ بھی جامِ جمشید کے برابر ہو جاتا ہے۔

ملت کی بنیاد کو وطن میں مت دیکھیئے ہوا پانی اور مٹی کی پوجا مت کیجئے۔ حسب نسب پر ناز کرنا نادانی ہے۔ اس کا حکم جسم میں ہے اور جسم فانی ہے۔ ہماری ملت کی بنیاد دوسری ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ ہم حاضر ہیں لیکن ہم نے اپنا دل غائب کے ساتھ باندھا ہوا ہے اس لئے ہم اس اور اس کی پابندی سے آزاد ہیں۔ ہمارا مدعا اور ہماری منزل ایک ہی ہے۔ ہمارے خیالات کا طرز و انداز ایک ہی ہے۔ اس کی نعمتوں کی وجہ سے ہم بھائی بھائی بنے ہیں اور یک زبان۔ یک دل اور یکجا ہو گئے ہیں)

رسالت کو علامہ اقبال نے ملت کا دوسرا رکن بتایا ہے۔ جیسا کہ ہم سب پر واضح ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ سلسلہ آنحضرت صلعم کی ذاتِ گرامی سے شروع ہوا۔ ان کا وجود ایسے زمانے میں ظہور پذیر ہوا جب ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور عرب قبائل میں جہالت اپنے عروج پر تھی۔ بت پرستی انتہا پر تھی۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا غلاموں کی خرید و فروخت اور قبائلی علاقائی منافرت ہی ملکی قانون تھا۔ مذاہب اور آسمانی کتابوں کو ان کے پیروکاروں نے اس قدر مسخ کر دیا تھا کہ وہ اپنی اصلی تعلیمات کو بالکل محو کر چکے تھے۔ اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس

کے مصداق طاقت کے بل بوتے پر ہی ہر مقامی اور بین القبائلی فیصلہ صادر رہتا تھا۔ آنحضرت صلعم کے ظہورِ پُرانوار کے بعد انہوں نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا جس میں اخوت، مساوات، احترامِ آدمیت اور اسلامی جمہوریت کا پیغام تھا۔ آپ کی آواز پر جلد یا بدیر جملہ عرب قبائل نے جو غیر شعوری طور پر تاریکی کے طویل مرحلے کے بعد روشنی کے منتظر ہی تھے، لبیک کہا اور آہستہ آہستہ ایک عظیم ملتِ اسلامیہ نے جنم لیا جو نہ صرف عرب بلکہ ایران، ترکی، افریقہ و وسطی ایشیا کے متعدد ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔ خلفائے راشدہ کے عہد میں تو صحیح معنوں میں ملتِ اسلامیہ کا سربراہ خلیفۃ المسلمین ہوا کرتا تھا جسے مسلمان قائدین کی مسلمہ حمایت حاصل ہوا کرتی تھی لیکن خلفائے راشدین کے بعد اگرچہ بادشاہت کا دور دورہ شروع ہوا لیکن پھر بھی ملتِ اسلامیہ کا تصور قائم رہا اور امیہ، عباسی اور عثمانی حکمران بھی خلیفۃ المسلمین ہی کہلاتے رہے۔ گویا اسلام کی عظیم قوت ان مختلف اقوام اور مختلف السنہ کے لوگ ملتِ اسلامیہ کے رشتے میں منسلک تھے اور اس طرح وہ دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سات آٹھ سو سال تک پوری دنیا میں کوئی ان کی ہم پلہ طاقت پیدا نہ ہوئی یہاں تک کہ ہم نے اسلام کی صحیح تعلیمات کو چھوڑ دیا اور نسلی اور علاقائی تعصبات میں پڑ گئے خانہ جنگیاں شروع کر دیں اور اس حشر کو پہنچے۔ علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کا وہی تصور پیش کیا ہے جس کے تحت مسلمان بحیثیت ایک ملت کے پوری دنیا پر چھائے رہے۔ انہوں نے مذہب اور رسالتِ محمدی ہی کو ملت کی اساس بتایا ہے اور بیت الحرام کو ملتِ اسلامیہ کا مرکزِ محسوس قرار دیا ہے۔

از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزو لا ینفک است
آں کہ شانِ اوست یہدی من یرید — از رسالت حلقہ گردِ ما کشید
حلقۂ ملت محیط افزا ستے — مرکز او وادیٔ بطحا ستے

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مُدعا گشتیم ما
دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم
این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ما کہ یکجانیم از احسانِ اوست
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رُسل را ختم و ما اقوام را
دل ز غیر اللہ مسلماں برکَند — نعرۂ لَا قَوْمَ بَعْدِی می زند

[ترجمہ:۔ رسالت کی وجہ سے ہی ہم اگرچہ لاکھوں ہیں لیکن سب ایک ہی ہیں ہمارے اجزا لاینفک کے اجزا ہیں۔ وہ جس کی شان یَعْدِیْ مَنْ یُرِیْدُ ہے۔ اس نے رسالت کے باعث ہمارے گرد حلقہ کھینچ دیا۔ ملت کا حلقہ امید افزا ہے اور اس کا مرکز بطحا کی وادی ہے۔ ہم اس کی نسبت کے حکم کی وجہ سے ایک ملت ہیں اور دنیا بھر کے لئے رحمت کا پیام ہیں۔ رسالت کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہم نوا ہو گئے اور ہم سب ہم نفس اور ہم مُدعا ہو گئے۔ دینِ فطرت ہم نے نبی سے سیکھا ہے اور حق کے راستے میں ہم نے مشعل روشن کی ہے۔ یہ موتی اسی کے بے پایاں سمندر کی وجہ سے ہے۔ ہم جو کہ ایک جان میں یہ اسی کا احسان ہے پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کی ہے۔ اور ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی ہے ہماری وجہ سے زمانے کی محفل میں رونق ہے انہوں نے ختمِ رسالت کی اور ہم نے ختمِ اقوام۔ مسلمان غیر اللہ سے اپنا دل ہٹا لیتا ہے اور لا قوم بعدی کا نعرہ لگاتا ہے۔]

علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کے آئین کی اساس قرآنِ حکیم کو بتایا ہے جس میں اخوتؐ مساوات۔ اسلامی جمہوریت اور معاشی و معاشرتی انصاف کی ضمانت دی گئی ہے۔ دینِ مصطفیٰؐ

دینِ حیات ہے اور اس کی تعبیر آئینِ حیات ہے۔ اسلام کا مذہب ایک نہایت ہی متحرک اور فعال معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے اور یورپین فلسفے کے برعکس سکون اور سُکر کی مذمت کرتا ہے۔ اسلام ہر لحظہ نئی سے نئی ترقی و تعمیر پر زور دیتا ہے اور جہدِ مسلسل کا علمبردار ہے۔ قرآن کی تعلیمات تقلید کی بجائے اجتہاد پر زور دیتی ہیں۔ قرآن جو تعلیمات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ وسعتِ قلبی اور وسعتِ مشرب اس کا خاصہ ہے۔ قرآنِ حکیم اقوامِ عالم کیلئے بھی ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے اور افراد کے لئے بھی آدابِ حیات پیش کرتا ہے۔ الغرض ضروری ہے کہ قومی آئین اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا انفرادی ضابطۂ اخلاق قرآنِ حکیم کے پیش کردہ اصولوں کے مطابق ہو۔ اور صرف یہی ایک صورت ہے جسے اپنا کر ہم اپنی گذشتہ عظمتوں کو پا سکتے ہیں ؎

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست — مثلِ خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستیٔ مسلم ز آئیں است و بس — باطنِ دینِ نبی ایں است و بس
برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے — ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے
آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — در فتد با سنگِ جام از زورِ او
می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بفریاد آورد
اے گرفتارِ رسومِ ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
تنگ بر مارہگذارِ دیں شداست ہر لعینے را زوادِ دیں شداست
اے کہ از اسرارِ دیں بیگانہ با یک آئیں ساز اگر فرزانہ

(ترجمہ: ملت کے ہاتھ سے جب آئین چلا گیا تو خاک کی طرح اس کے اجزا بھی ٹوٹ گئے۔ مسلم کی ہستی صرف آئین ہی سے ہے دین نبی کا باطن صرف یہی ہے۔ جب اسے آئین کی پابندی ملی تو یہ برگِ گل ہوگیا جب پھول کو آئین کی پابندی ملی تو یہ گل دستہ بن گیا آواز کی پابندی کے ضابطے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ آواز سے جب ضابطہ چلا جاتا ہے تو آواز صرف شور و غوغا بن کر رہ جاتی ہے۔

وہ زندہ کتاب یعنی قرآن حکیم جس کی حکمت لایزال اور قدیم ہے، وہ زندگی کے استحکام کے اسرار کا نسخہ ہے۔ اس کی قوت سے بے ثبات چیزیں ثبات حاصل کرتی ہیں۔ خام شوق اس کی وجہ سے پختہ تر ہو جاتا ہے اور اس کے زور سے شیشہ پتھر سے جا ٹکراتا ہے۔ وہ قید و بند میں جکڑے ہوؤں کی بجائے آزادوں کی دنیا پیدا کرتا ہے اور جکڑے ہوئے شکار کے لئے باعثِ فریاد بنتا ہے۔ اے کہ تیرا ایمان رسوم میں گرفتاری ہے اور کافری شیوہ تیرا قید خانہ ہے۔ اگر تو مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد قوم کی بساط کو درگوں کر دیتا ہے (اجتہاد اچھی چیز ہے لیکن انحطاط کے دور میں حاکموں کے اثر سے اس کی وجہ سے مذہب کی غلط تاویلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا زمانہ انحطاط میں اپنے گذشتہ سنہری زمانے کی روایات کی تقلید ہی اجتہاد سے بہتر ہے) ہم پر دین کا راستہ تنگ ہو گیا ہے اور ہر کمینہ و سفلہ دین کا رازدار بن بیٹھا ہے۔ اے کہ تو دین کے رموز سے بیگانہ ہے اگر تو عقلمند ہے تو ایک ہی آئین کے ساتھ پیوستہ رہ!)

الٰہیّت اور عبادت

کائنات کے پیدا کرنے والی اُس ذاتِ باری تعالیٰ سے انکار مذہبی نقطۂ نظر سے تو خیر ممکن ہے ہی نہیں فلسفی اندازِ فکر بھی اُس کی موجودگی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے۔ چاہے ہم اُسے اللہ کا نام دیں۔ قدرت کا یا قادرِ مُطلق کا۔ جب کوئی شخص اپنی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے اپنی۔ اپنے خاندان کی۔ اپنے مُلک و قوم کی یا بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے بھرپور سعی کرتا ہے تو اپنی خودی میں ذاتِ باری کی خودی کا عکس یا رنگ شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ اللہ واحد لاشریک ہے۔ ہر چیز اُسی کی وجہ سے ہے۔ نہ ہی اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا اور کوئی بھی اُس کی برابری کرنے والا نہیں لیکن جب ہم اپنی خودی کی قوتوں یعنی خود شناسی، خود اعتمادی اور خود آگاہی کی قوتوں کو پہچانتے ہوئے سخت محنت اور زیرکی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح

اپنی تقدیر بدلنے کی سعی کرتے ہیں تو اس سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی خودی کے خلاف نبرد آزما ہیں یا اُس کی ذات سے مُنکر ہیں بلکہ اُس کی خودی کا عکس اپنی قوتوں میں شامل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ذاتِ باری ہر چیز پر قادر ہے اور اُسے ہر قسم کی طاقت حاصل ہے تبھی تو ہم بھی اس طاقت کا رنگ اپنے آپ میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اِس کائنات اور اُس کی ہر چیز کی تخلیق پر قادر ہو تو آخر ہم کس کی تقلید میں ایسا کر رہے ہوں گے اور ہماری طاقت کا منبع کیا ہوگا۔

حضرتِ آدم اور حوّا کے جنّت سے نکالے جانے کا قصّہ باقی مذہبی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ شیطان کے اُکسانے پر حضرتِ آدم نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا جس کی بنا پر اُنہیں جنّت سے نکالا گیا اور اُن کے نئے ٹھکانے یعنی زمین پر پھینک دیا گیا۔ بعض دفعہ اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اور یہ عیسائیت کے پھیلائے ہوئے مفہوم کی وجہ سے ہے۔ یعنی حضرتِ آدم کے گناہ پر اُنہیں سزا کے طور پر اِس دُنیا میں بھیجا گیا اور یہ دنیا انسان کے لئے ایک قید خانے کے موافق ہے جہاں وہ سزا بھگتنے کے لئے بھیجا گیا۔ اِسلام میں اِس کے برعکس یہ تصوّر پیش کیا گیا کہ انسان نے اپنی مرضی کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے شجرِ ممنوعہ چکھا۔ اُس کی یہ پہلی غلطی اللہ تعالیٰ نے معاف فرمائی اور اُسے زمین پر بھیجا تاکہ وہاں وہ اُس کے نائب کے طور پر رہے۔ اُسے شخصیت کی دولت عطا کی گئی تاکہ وہ اس زمین کے خزانے اپنی بہتری کے لئے استعمال کر سکے۔ گویا اچھا عمل یا بُرا عمل کسی پر فرض نہیں کر دیا گیا۔ یا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ازل سے اُن کی قسمت میں لکھ دیا گیا۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کے لئے برابر کے مواقع مہیا کیئے ہیں اور یکساں قابلیتیں عطا کی ہیں۔ اگر کسی میں ایک قابلیت دوسرے کی نسبت زیادہ عطا کی ہے تو دوسرے کی تلافی کسی اور قابلیت سے کر دی

گئی ہے۔ البتہ قانونِ قدرت یہ ہے کہ اچھے عمل کرنے والا شخص یعنی محنتِ شاقہ، عملِ پیہم اور مشکلات اور تکالیف میں صبر و استقامت اختیار کرنے والا شخص۔ اور اسی طرح دوسرے بلند اعمال کا حامل شخص اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بلند مرتبہ پائے گا اور سرخرو ہوگا۔ اس کے برعکس بُرے اعمال اختیار کرنے والا شخص جو سست الوجود ہو۔ خود اپنی ہمت اور محنت پر بھروسہ نہ کرے مشکلات اور تکالیف میں ہمت ہار بیٹھے اور اسی طرح کے دیگر اعمال کا حامل ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہوگا۔ پس تقدیر یعنی اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے سے یہ مُراد ہے کہ اُس نے قانونِ قدرت وضع کر دیئے۔ مختلف اشیاء کے عمل اور ردِعمل کے اصول وضع کر دیئے۔ اُن اُصولوں کے مطابق مرحلے طے ہوں گے۔ اُن سنہری اُصولوں میں سے ایک جو کہ انسانوں کے افعال سے تعلق رکھتا ہے وہ ہے جو اوپر بتایا گیا یعنی محنت، ہمت، مشکل وقت میں صبر و استقامت اور زیرکی۔ اس کا ردِعمل ہوگا تعمیر۔ اس کے برعکس سست الوجودی، کم ہمتی، مُشکل وقت میں ہمت ہار بیٹھنا اور زیرکی سے کام نہ لینا۔ اس کا ردِعمل ہوگا۔ ذلت اور تنزل۔ اگر بنی نوعِ انسان کا نظام اس قانونِ فطرت یا اُصولِ قدرت کے مطابق چل رہا ہے تو ہمیں الہٰیت یا قدرت یا قادرِ مطلق کی خودی پر ایمان لانا پڑے گا۔ ہاں اگر یہ قوانینِ قدرت کبھی جھوٹے ثابت ہوتے نظر آئیں تو البتہ یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ شاید موجود نہیں تبھی اُس کے کوئی اصول ہر چیز میں جاری و ساری نظر نہیں آتے۔

اللہ تعالیٰ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ وہ خالق ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ہر قسم کی طاقت رکھنے والا ہے۔ اور ابدیت کا حامل ہے۔ یہ اوصاف بھی فلسفی اندازِ فکر سے مُکمل طور پر ثابت ہیں یہ کائنات اس انداز کی نہیں کہ کسی وقت اپنی اس صورت میں کسی وجہ سے آگئی ہو اور اُسی طرح قائم ہو۔ بلکہ اس کی ہر چیز میں ہیجان ہے اور نئے سے نئے سیاروں کی تخلیق کا عمل جاری ہے۔

ختم نہیں ہوا۔ پس ہم پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی تقلید میں ہم تخلیق و تعمیر کی سعی کریں۔ پرانی اور بیعاد ختم شدہ چیز تو اپنی موت مر ہی جائے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ متواتر تخلیق و تعمیر کے لئے کوشاں رہیں کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کو عزیز ہے اور اسی میں اپنی اور کُل بنی نوعِ انسان کی فلاح مُضمر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ سب کائنات ایک آئینے کی مانند موجود ہے جس سے کل واقعات جو کسی بھی زمانے کے ہوں ایک ہی نظر میں اُس کے سامنے ہوتے ہیں۔ کوئی واقعہ یا عمل اس کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ قرآن کی تعلیمات ہمارے لئے گہرے معنی رکھتے ہیں۔ قرآن میں بتایا ہوا کوئی واقعہ یا ذاتِ باری تعالیٰ کی صفت ہمارے لئے کسی گہرے اخلاقی اور عملی سبق سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ اپنے علم و فضل کے اضافے میں ہر دم کوشاں رہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے اگر ہمیں چین جانا پڑے تو وہاں بھی جائیں۔ اور پھر علم و فضل سے مُراد صرف مذہبی علوم نہیں بلکہ جملہ جدید علوم بھی اسی صف میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دِن کے رات میں تبدیل ہونے اور رات کے دن میں تبدیل ہونے میں ہمیں گہرے مطالب کی نشاندہی کی ہے اور اُنہیں سمجھنے کی کوشش پر ہمیں اُکسایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ جدید سائنسی علوم میں کوئی امر غیر اسلامی نہیں جیسے کہ بعض طبقات میں فرض کیا جاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طاقت سے انکار تو ممکن ہی نہیں۔ جب وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر تبدیلی اُسی کے وضع کئے ہوئے قوانین کے تحت طے پا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز کی طاقت کا مالک ہوا۔ عناصرِ فطرت جتنے بھی ہیں یعنی آندھی طوفان، سمندر، پہاڑ، دریا۔ اسی کے وضع کئے ہوئے اُصول کے تحت کارفرما ہیں۔ گویا اُسی کی طاقت کے ماتحت ہیں۔ اِس میں ہمارے لئے یہ پیغام ہے کہ ہم بھی عناصرِ فطرت کی تسخیر کی سعی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کریں۔ اگر امریکہ اور روس تسخیرِ فطرت کے میدان میں اتنا آگے جا سکتے ہیں تو آخر مسلمان کیوں پیچھے رہے جس کا ایمان ہی یہ ہے کہ تسخیرِ فطرت

کا پیغام اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں نہ صرف اپنی صفات کی بنا پر بلکہ قرآن میں جگہ جگہ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصیت ابدیت ہے۔ کائنات تو اُس کا پیدا کردہ ایک معمولی کارنامہ ہے۔ یہ کائنات قائم رہے یا نہ رہے۔ یا اِس کائنات کے بعد اور کئی کائناتوں کا دور شروع ہو یہ تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ امر واضح ہے کہ ان سب سلسلوں کا خالق ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِسی صفت کی تقلید میں ایک تو بنی نوعِ انسان نے اپنی ابدیت کی کوشش اِس طرح کی کہ ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ نسلِ انسانی کے پھیلاؤ کا عمل جاری ہے۔ وقت آنے پر موتیں آتی ہیں لیکن بنی نوعِ انسان کی زندگی وہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ انسان زندہ ہے اور ایک طرح کی ابدیت اُسے حاصل ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے برابر ابدیت اُسے حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اگر یہ زمین یا کائنات ہی فنا ہو گئی تو انسان کی بقا کہاں تک قائم رہ سکتی ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ کی ابدیت میں ہمارے لئے یہ پیغام موجود ہے کہ ہم اس عارضی زندگی میں ایسی تخلیقات اور اعمال کر جائیں جو رہتی دنیا تک ہماری یاد تازہ رکھیں اور ہمیں انسانیت کے محسن کے طور پر یاد کریں۔ مشکلات اور تکلیفات میں بھی نہ صرف صبر و استقامت کو قائم رکھیں بلکہ تکلیف سے پیدا کردہ زبردست طاقت کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے تعمیری اور تخلیقی کاموں میں انتہائی جوش و خروش سے سرگرم عمل رہیں۔

اسلام میں عبادت کا تصور یہ ہے کہ نہ صرف اللہ اور اُس کے پیغام کو سمجھا جائے بلکہ اُس کی رفاقت محسوس کرتے ہوئے اپنے نیک اعمال اور بلند عزائم میں اُس کی طاقت کو شاملِ حال کیا جائے۔ اِس دُنیا کا حقیر ترین شخص بھی عبادت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رفاقت کے احساس کا فخر محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت بلند و بالا تصور کرتا ہے۔ اور اپنے آپ میں تسخیرِ عناصر کے عزائم اور ہمتیں پاتا ہے۔ پس اِسلام میں عبادت کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ دن میں پانچ وقت یا باقی تہواروں

کے موقع پر یا جمعہ کے دِن ہم رسمی طور پر یا دُنیا کے دکھاوے کے لئے مسجد میں جاکر مقررہ طریقہ پر نماز ادا کریں۔ بلکہ ضروری یہ ہے کہ سب سے پہلے تو ہم نماز کے مفہوم کو سمجھیں اور اس پر غور و خوض کریں۔ کلامُ اللہ کی اِتنی سی قدر تو ہمارے لئے فرض ہونی چاہیئے کہ ہم اُسے سمجھ بوجھ تو لیں۔ اِس کے بعد اُس کلام میں دیئے گئے احکامات کی روشنی میں باعمل بننے اور دنیاوی کاموں میں ہمت و استقامت ڈھونڈنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی رفاقت و اعانت محسوس کرنی چاہیئے۔ عبادت بطور روحانی روشنی کے ایک نہایت اہم عمل ہے جس کے ذریعے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اچانک اپنی خود کار صلاحیتوں کی طاقت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ روحانی روشنی انسانی شخصیت کی تعمیرِ نو میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حقیقتاً عبادت کو ذہنی عمل کے ساتھ ایک ضروری اضافی جُزو سمجھنا چاہیئے۔ قدرت کا سائنسی مطالعہ ہمارے لئے حقیقت سے قریبی تعلق پیدا کرتا ہے اور اِس طرح ہمارے اندرونی شعور کو تیز تر کر دیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علم کی جملہ تلاش عبادت ہی کی ایک قسم ہے اور حُصولِ علم ہی، جن میں جدید سائنسی عُلوم بھی شامل ہیں، انسان میں تسخیرِ عناصر کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اسلام میں اجتماعی عبادت کے نظریئے کی افادیت پر بھی زور دیا ہے۔ عبادت کی رُوح ہی اجتماعیت اور معاشرتی ہے۔ ایک فقیہہ بھی جب دُنیا کو ترک کر کے عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اُس کے اِس عمل کے تحت یہی خیال کارفرما ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رفاقت سے حظ اُٹھائے گا۔ باجماعت عبادت میں فلسفہ مضمر ہے کہ جب ایک پورا اجتماع اکٹھا ہو کر کسی ایک جذبے پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے تو اُس کی دل و نگاہ اور سمجھ بوجھ کی قوتیں بے انتہا تیز ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ایک اہم نفسیاتی مسئلہ ہے کہ اجتماعیت ایک عام آدمی کی سمجھ بوجھ کی طاقت کو کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے۔ اُس کے جذبات کو زیادہ

گہرا کرتی ہے اور اُس کی قوتِ ارادی کو اِس قدر زیادہ مضبوط بنا دیتی ہے گویا اُس میں پارہ بھر دیا گیا ہو۔ عبادت کے وقت ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جُھک جاتے ہیں یعنی اللہ کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں لیکن اِس کے ساتھ اگر عبادت صحیح جذبے سے کی جائے تو ذاتِ باری کی خودی کا عکس اپنی خودی میں پا کر بھرپور صلاحیتوں کا حامل اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ نماز کے وقت امیر، غریب، حاکم، محکوم، گورے، کالے سبھی ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں اور اس طرح مُساوات کا اُصول واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو جو مختلف نسلوں، قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا ہے سو محض شناخت کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اصل برتری اور بہتری تو اُن کے اعمال ہیں۔ اگر کسی زمانے میں کالے لوگ محکوم و مذموم رہے تو اِس وجہ سے نہیں کہ اُن کا رنگ کالا تھا یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کالوں کو بنایا ہی محکومی کے لئے ہے بلکہ اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کالے لوگ بے عمل ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے علوم و فنون کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اُنہوں نے محنتِ شاقہ کی عادت چھوڑ دی تھی اور اپنے دماغ کو استعمال کرنا بھول چکے تھے۔ اُن میں بے اتفاقیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، قانونِ قدرت نے اپنا ردِ عمل دکھایا اور یہ لوگ محکوم و مذموم ہوئے۔ اِسی طرح گورے لوگ بھی بعض وقتوں میں اِنہی وجوہات کی بنا پر ذلیل رہے ہوں گے لہٰذا کالے اور گورے کی تمیز یا برہمنیت اور شودروں کا امتیاز انتہائی غیر اسلامی ہے اور نماز کا عمل اِس مساوات کو سب سے زیادہ واضح کرتا ہے۔

مذہب کیونکر ممکن ہے؟

مشہور فلاسفر کانٹ (KANT) نے سب سے پہلے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا علم مابعد الطبیعیات ممکن ہے۔ اُس کے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ کسی تجربے کے لیے حسیات کی وسیع دنیا سے باہر رہنا اُس کے خیال میں ممکن نہ تھا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ کانٹ کا یہ خیال آسانی سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اُن کی رائے میں سائنس کے جدید نظریات مثلاً وقت اور خلا کا محدود پن۔ کائنات کا کسی خیال پر مبنی ہونا، مادّہ کا روشنی کی لہروں سے مماثلت وغیرہ اور قدرت کا غیر معیّنہ پن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مذہبیات کا منطقی جواز پیش کرنا مشکل امر نہیں۔ جیسا کہ کانٹ کا خیال تھا۔

کانٹ کا نظریہ صرف اُسی صورت میں درست مانا جا سکتا ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عام سطح کے تجربات کے علاوہ اور کسی قسم کا تجربہ ممکن ہی نہیں۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ عام سطح کے تجرباتِ حسیاتِ انسانی کے احاطہ میں آنے والے تجربات

کے علاوہ کسی اور قسم کا تجربہ بھی ممکن ہے جو انسانی علم میں اضافہ کا باعث ہو سکے۔ اگر کانٹ کا معروضہ غلط ثابت ہوا یعنی یہ ثابت ہوا نظر آجائے کہ عام سطح کے علاوہ اور تجربات بھی ایسے ہو سکتے ہیں جن کے نتائج بنی نوعِ انسان کی فلاح کا باعث بن سکیں تو مذہبیات یا مابعد الطبیعات کا ممکن ہونا بالکل واضح ہو گا۔

سائنس کے موجودہ نظریات سے یہ واضح ہے کہ بیرونی دنیا جس کا ہم حسیات کی مدد سے احاطہ کر سکتے ہیں ہو سکتا ہے کہ محض ہمارے ذہن یا شعور کی تعمیری صلاحیت کا نتیجہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وقت اور خلا کے مختلف سسٹم ہوں جو ہمارے احاطہ سے باہر ہوں۔ اور جن کی سمجھ بوجھ ہمارے عام تجربات کی زد میں نہ آئے جیسا کہ سائنس کے جدید نظریات سے ظاہر ہے۔ اس طرح تجربات کی اور سطحیں بھی ہو سکتی ہیں جو ہمارے عام تجربات کے علاوہ ہوں۔ الہیاتی وقت اور خلا کی تلمیحیں بھی ہمارے صوفیوں نے استعمال کی ہیں۔ پس موجودہ سائنسی نظریات اور اونچے صوفیا کے خیالات دونوں اسی نکتہ پر ہماری نظر مرکوز کرتے ہیں جنہیں مابعد الطبیعاتی کہا جا سکے۔

مذہب اپنی سطح کے تجربات کا بھی اُسی طرح جائزہ لیتا ہے جس طرح سائنس اپنی سطح کے تجربات کا جائزہ لیتی ہے اور مذہب نے اس تنقیدی جائزہ کی بنیاد سائنس سے بہت پہلے ڈالی۔

اس مسئلے کو ایک اور طریقے پر بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا صرف خالصتاً شعوری یا ذہنی ارتقا کا طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے عناصرِ فطرت پر قابو پایا جا سکے۔ پروفیسر ریڈنگٹن کا کہنا ہے کہ فزکس حقیقت کا صرف جزوی طور پر جائزہ لے سکتی ہے۔ محسوسات۔ اقدار۔ اور مقاصد ہمارے شعور اور حسیات کے عکس کو تخلیق کرتے ہیں۔ یہ سائنس کا میدان ہے۔ ہمارے وجود کا دوسرا جزو یعنی روح بھی ہماری خودی کی بلندی کا باعث بن کر ہمیں تسخیرِ فطرت

کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور یہ روحانیت۔ مذہبیات یا مابعد الطبیعات کا راستہ ہے۔ جدید انسان ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ شعور کی تعمیر کے انحصار نے اُسے عناصرِ فطرت پر عبور تو دے دیا لیکن وہ خود اپنے مستقبل پر سے اعتبار کھو بیٹھا۔ گویا اپنی ذہنی کاوشوں کے نتائج سے مرعوب ہو کر وہ رُوحانیت کے ساتھ رہنے یا اپنی اندرونی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت کو کھو بیٹھا۔ یہ حال تو مغرب کا ہے۔ مشرق کا حال اِس سے بھی بُرا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کا تصوّف اور مذہبیات کی بُلندی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے مشرق اور مغرب میں اس قدر زیادہ ترقی کی، اب مکمّل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ مذہب کی اعلیٰ قدروں کو چھوڑ کر اب مذہبیات کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دُنیا کو مکمل طور پر تیاگ دیا جائے اور اِس طرح اپنی جہالت اور رُوحانی فقدان میں ہی مکمّل خوشی محسوس کی جائے۔ حالانکہ مذہب اپنے بُلند اور ارفع معنوں میں نہ تو کوئی بندھا ٹکا جامد قسم کا ضابطہ ہے نہ مولویت کا راج ہے اور نہ ہی کسی قسم کے مخصوص رسوم و رواج کا پابند ہے۔ اِس کے برعکس مساوات فلاحِ بنی نوعِ انسان یعنی فلاحی معاشرہ اور ترقی و تعمیر کے نظریات جس میں جدید علوم کی ترویج و ترقی بھی شامل ہے، مذہب ہے جس میں رُوحانیت کی چاشنی بھی بھرپور طریقے پر موجود ہو۔ یہی صورتِ حال انسانیت کی نجات اور بُلند ترین مقاصد کے حُصول کا باعث بن سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے مطابق مذہبی زندگی کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی اعتقاد سوچ بچار یا ریاضت اور حقیقت یا صحیح راستے کو پالینا۔ پہلے حصّے میں مذہبی زندگی ایک قسم کا ضبط و نظم یا ڈسپلن پیدا کرتی ہے جس میں فرد یا قوم کو احکامات کی مکمّل پابندی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ بغیر اِس کے کہ وہ اس کو سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ رویہ کسی قوم کی سماجی یا سیاسی ترقی کے لئے تو بہت اہم ہو سکتا ہے لیکن کسی فرد کی اندرونی ترقی کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اِس نظم و ضبط کے بعد اسے شعوری اور ذہنی طور پر سمجھنے کا دور آتا ہے۔ اِس دور

میں اُن احکامات اور نظم وضبط کی شعوری توضیح ضروری ہوتی ہے۔ اِس دور میں مذہبی زندگی کی بنیاد مابعد الطبیعات ہوتی ہے۔ اِس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں مابعد الطبیعات کی جگہ سائیکالوجی یا نفسیات لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ الہیاتی حقیقت کے ساتھ انتہائی قرب کا تعلق پیدا ہو۔ اِس مرحلہ پر مذہب' زندگی اور طاقت کو اپنے آپ میں سمو لیتا ہے۔ مذہب کے اِس آخری مرحلے میں ہی وہ روحانی تجربے حاصل ہوتے ہیں جس میں تسخیرِ فطرت کے راز افشا ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے مذہبی زندگی کے اِس حصے یعنی تصوف کو دنیا کے تیاگ دینے اور حقیقت سے بہت دور ہو جانے کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ مذہب کی بلندیاں بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش کا نام ہے اور جس کی بنیاد تجربات پر ہے۔ اور سائنس سے بہت پہلے مذہب نے اِس کی بنیاد رکھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی اور سائنسی توجیہات' اگرچہ اُن میں مختلف طریقے استعمال ہوتے ہیں' اپنے آخری مقصد کے لحاظ سے یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ دونوں کا مقصد یہی ہے کہ اصل حقیقت تک جا پہنچیں۔ شیخ احمد سرہندی نے روحانی ارتقا کی منازل بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ قلب کے ارتقا کی پہلی منزل میں انسان کو دُنیا کی ہر شے میں خدا کا عکس نظر آتا ہے یعنی خدا کے علاوہ کوئی اور چیز یہاں تک کہ خود اُس کی زندگی بھی نظر نہیں آتی۔ ارتقاءِ قلب کے آئندہ مرحلے روح۔ سرِ خفی اور سرِ اخفا ہیں۔ اِن میں سے ہر سٹیشن میں اُسے اپنے مخصوص تجربات کا سامنا ہوتا ہے اور انہیں مجموعی طور پر عالمِ امر کہا جاتا ہے۔ اِن جملہ سٹیشنوں سے گزر جانے کے بعد حقیقت کے متلاشی کو الہیاتی ناموں اور الہیاتی صفات کے پُرانوار مطالب واضح طور پر مل جاتے ہیں اور بالآخر ذاتِ الٰہی کی روشنیاں بھی اُس پر واضح ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ اپنی حالت کا تجزیہ کرنے کے لئے تین گواہوں سے اپنے سٹیشن یعنی مقام کے بارے میں استفسار کرو۔

پہلا گواہ خود تمہارا اپنا شعور ہے۔ دوسرا گواہ کسی اور کی خودی کا شعور ہے اور سب سے آخری گواہ الٰہیاتی شعور ہے۔ اگر الٰہیاتی شعور کی روشنی میں بھی تم پورے اُترے ہو تو واقعی سمجھ لو کہ تم نے اصل حقیقت کو پالیا۔ کیونکہ وہی شخص اصلیت کا حامل ہے جو اللہ تعالیٰ کے معیار پر پورا اُتر سکتا ہے۔

مذہبی تجربے کی ماہیّت اور خصوصیات

پروفیسر وائٹ ہیڈ کا قول ہے کہ مذہب کا زمانہ منطق کا زمانہ ہے۔ یعنی مذہب کی منطقی توجیح پیش کی جاسکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فلسفہ کسی طرح مذہب سے بُلند تر ہے۔ مذہب حقیقت کا جزوی جائزہ نہیں لیتا یہ نہ محض خیال ہے۔ نہ محض جذبہ یا احساس ہے اور نہ ہی محض عمل ہے۔ بلکہ یہ انسان کی بہ حیثیتِ مجموعی ترجمانی کرتا ہے۔ پس مذہب کی توجیح کے سلسلے میں فلسفے کو اِس کی یعنی مذہب کی مرکزی حیثیت پہچاننی پڑے گی۔ نہ ہی اِس امر کی ضرورت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ خیال اور اندرونی جذبہ یا احساس یا بشارت (یا اِسے وحی کہیئے) کسی طرح ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اِن دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خیال جو ذہنی شعور یا (INTELLECT) کی پیداوار ہے حقیقت کو تھوڑا تھوڑا کرکے مرحلہ بہ مرحلہ حاصل کرتا ہے۔ جبکہ اندرونی جذبہ یا وحی حقیقت کو بحیثیتِ مجموعی ایک ہی دفعہ حاصل کرلیتی ہے۔ ذہنی شعور حقیقت کے عارضی یا دنیاوی پہلو

کو پیشِ نظر رکھتا ہے جبکہ وحی یا مذہبی تجربہ اس کے ابدی پہلو پر نظر رکھتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جیسا کہ برگساں کا خیال ہے وحی یا روحانی تجربہ ذہنی شعور کی ہی ایک بلند تر صورت ہے۔

انسان کی تقدیر کا یہ ایک لازمی جزو بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات مر بعضہ کے گہرے فوائد سے استفادہ کرنے کا باعث بنے۔ اس سلسلے میں کبھی تو اُسے خود اپنے آپ میں کائنات کی قوتوں سے نباہ کرنے کے لئے لچک پیدا کرنی ہوگی اور کبھی اپنی پوری قوت کو تسخیرِ کائنات پر صرف کرنا ہوگا تاکہ اُسے اپنے فوائد کے لئے استعمال کر سکے اور ترقی و تعمیر کی اس راہ پر خود اللہ تعالیٰ اُس کا ممد و معاون ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا بشرطیکہ آدمی خود دستِ ہمّت دراز کرنے میں پہل کرے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ

(ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ انسانوں کی حالت تبدیل نہیں کرے گا جب تک وہ خود اپنی بہتری کی کوشش نہ کریں۔)

اگر انسان دستِ ہمّت دراز کرنے میں پہل نہیں کرتا، اگر وہ زندگی میں اندرونی طور پر ترقی کرنے کی خواہش کو محسوس نہیں کرتا، تو پھر اُس کی روح جو اُس کے اندر موجود ہے اور اُسے ترقی و تعمیر کی طرف ہر لحظہ متوجہ کرتی رہتی ہے، پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے اور مُردہ ہو جاتی ہے جس کے لئے خود ہماری بے ہمّتی ذمہ دار ہوتی ہے لیکن زندگی اور آگے بڑھنے کی خواہش کی تکمیل عقل اور ہوش مندی، تسخیرِ فطرت کے سلسلے میں تحصیلِ علوم اور محنتِ شاقہ ہی سے ہوتی ہے۔ گویا روحانی یا مذہبی جذبہ سے محنتِ شاقہ کی جائے تو ترقی و تعمیر کی تمام خواہشات پوری ہو سکتی ہیں۔

مذہبی یا صوفیانہ تجربے کی خاص خاص خصوصیات علامہ اقبال نے یوں بیان کی ہیں۔

۱۔ تصوّف کے تجربہ کے سلسلے میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ تجربہ بلاواسطہ طور پر ہوتا ہے۔

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی ذات یا حقیقت سے اُسی طرح واقفیت حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں جیسا کہ اور چیزوں کو دیکھتے بھالتے اور جانتے ہیں۔ تجربات تمام ہی بلا واسطہ ہوتے ہیں اور ہمارے اِس دُنیا سے متعلق معلومات پر اُن کی کامیابی منحصر ہے۔ اِسی طرح مذہبی جذبہ کی کامیابی کا انحصار اِس امر پر ہے کہ ہم ذاتِ خداوندی کے علم کی کہاں تک ترجمانی کر سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صوفیانہ تجربہ ہمیں بہ حیثیت مجموعی کسی اُولیٰ مسئلے کا جواب بہم پہنچاتا ہے۔ اِس میں جزوی طور پر اُس کی سائنسی توجیہہ ڈھونڈنا عبث ہے۔ بہ حیثیت مجموعی وہ حل درست ہوگا اور ہو سکتا ہے مدّتوں بعد یا کچھ عرصہ بعد ہی سائنس بھی اُس کا جواز اپنی پوری تفصیل سے مرحلہ بہ مرحلہ پیش کر سکے لیکن اِس وقت وہ رُوحانی تجربہ بحیثیتِ مجموعی مختصراً صحیح منزل کی نشاندہی کر دیتا ہے۔

۳۔ تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تصوف کی حالت ایسے لمحات ہوتے ہیں کہ اُن میں صوفی بزرگ کو ذاتِ باری سے انتہا درجے کا قُرب حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ذات پر بھی ذاتِ باری ہی کو حاوی دیکھتا ہے۔ اور اِس طرح الٰہیاتی رہبری ہمارا دامن پکڑتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس حقیقت کا کھوج ہمیں مِلتا ہے جس کے ہم متلاشی ہوتے ہیں۔ مفسرین کے لئے اِتنا ہی بتا دینا کافی ہونا چاہیئے کہ آخر ہم اپنی روزمرّہ کی معاشرتی زندگی میں اوروں کے دل کی بات بھی تو بُوجھ لیتے ہیں۔ یہ امر اُن کے اطوار، عادات۔ اور منشا وغیرہ کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رضا اگر کسی صُوفی پر بشارت کے ذریعے واضح ہو تو ایسا ناممکن کیوں ہو سکتا ہے۔

۴۔ چونکہ صوفیانہ تجربہ صرف محسوس ہو سکتا ہے اور کوئی واضح خیال نہیں ہوتا لہٰذا اُسی صورت میں اِسے اوروں کو بتایا نہیں جا سکتا۔ صوفی یا پیغمبر اپنے مذہبی شعور کی جس طرح ترجمانی کرتا ہے وہی تجاویز لوگوں کے سامنے رکھی جا سکتی ہیں لیکن اصل جذبہ یا محسوسات بتائی نہیں جا سکتیں یعنی

ظاہر ہوا کہ مذہبی احساس اور خیال اندرونی تجربہ کے ہی ابدی اور عارضی یا دنیاوی پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں اگر کوئی ضرب اچانک لگے تو ہم پہلے تو دم بخود ہو کر رہ جاتے۔ نہ ہمیں کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ ہوا کیا ہے اور پھر بھی ہمیں اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ہوا۔ تجربہ ایک لمحہ کے لئے ذہنی شعور کی تاریکی میں احساس بن کر چھپا رہتا ہے یہاں تک کہ خیال اُس سے ہمکنار ہوتا ہے اور صحیح حقیقت واضح ہوتی ہے۔ خالص حدیہ یا احساس خیال سے ہمکنار ہو کر اپنی تقدیر کو پالیتا ہے جو اپنے لئے کوئی مخصوص لبادہ اوڑھ کر سوسائٹی کے سامنے آتا ہے اور اس طرح بنی نوعِ انسان اُس سے آگاہ ہوتے ہیں۔

۵۔ صوفی کے ابدیت یا ذاتِ باری تعالیٰ سے انتہائی قُرب کے تعلق کی وجہ سے اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیاوی وقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن اِس سے یہ مُراد نہیں کہ وہ اُس تصوف کے تجربہ کے وقت اس دنیا میں اور اِس میں جاری و ساری وقت سے اپنا تعلق اُس عرصہ کے لئے توڑ لیتا ہے۔ بلکہ ایک مخصوص طریقہ پر یہ تعلق قائم رہتا ہے۔ یہ اِس سے بھی ظاہر ہے کہ صوفیانہ تجربہ یا وجدیا (TRANCE) کا مرحلہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اور صوفی اور پیغمبر دونوں دوبارہ اپنی عام زندگی میں واپس آجاتے ہیں۔ البتہ یہ مرحلہ اپنا ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

پس ظاہر ہوا کہ حُصولِ عُلوم کے سلسلے میں صوفیانہ تجربہ بھی اُتنا ہی واقعی اور اصلی ہے جتنا کہ کوئی اور تجربہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جہاں جدید سائنسی عُلوم وغیرہ کے ذریعے جن کا تعلق ذہنی شعور یا (INTELLECT) سے ہے مکمل طور پر استفادہ کرنا ہے اُس کے ساتھ ساتھ مذہبی تجربہ یا صوفیانہ سوچ بچار جو انتہائی مذہبی جذبہ اور فلاحِ نوعِ انسانی کی بُنیاد پر کی جائے سے بھی استفادہ کرنا ہمارا حق ہے۔ اگر نوعِ انسانی کو اتنے پیغمبروں اور صُوفیا نے اِس ذریعے

سے فائدہ پہنچایا ہے تو ہم کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہوئے اس سے انکار کریں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دُنیا کے اور انسان نے جتنی ترقی کرنی تھی کر چکے تب تو ایسا سمجھنا شاید درست بھی ہو۔ لیکن یہ خیال انتہائی غیر اسلامی ہے۔ اسلام ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ کائنات میں ہر لحظہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بنی نوعِ انسان بھی تغیر کے مرحلوں سے متواتر گذر رہا ہے اور جتنی ترقی بھی ہم نے کی ہے اُس سے نہیں معلوم کتنی ہزار گنا ترقی ابھی مزید کرنی ہے۔ لہٰذا جدید سائنسی علوم کے علاوہ رُوحانی تجربہ یا تصوف کے تجربہ کا دامن چھوڑ دینا، جو ہمیں مکمل حقیقت تک تھوڑے سے عرصے میں پہنچا دیتا ہے، صریحاً غلط ہے۔

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایسی آزمائشیں ہیں جن پر ہم اِن روحانی تجربوں کے نتائج کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔ اِن میں سے ایک ذہنی شعور کی آزمائش ہے اور ایک اُسے عملی جامہ پہنا کر دیکھنے کی آزمائش ہے۔ ذہنی شعور کی آزمائش سے مُراد تنقیدی تفسیر ہے۔ یعنی جدید علوم کی روشنی میں اُس کے تنقیدی جائزے کی کوشش کی جائے۔ عملی جامہ پہنا کر دیکھنے کی آزمائش سے مُراد یہ ہے کہ اُن تجاویز سے جو فائدے ہوتے ہیں اُنہیں پرکھا جائے کہ آیا یہ واقعی بنی نوعِ انسان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ اِن کسوٹیوں پر پورا اُترنے والی رُوحانی تجربے پر مبنی تجاویز کو قابلِ قبول سمجھنا چاہیئے چونکہ اُن میں شیطان کی طرف سے کسی غلط رہبری کی ملاوٹ نہ ہوگی جس کا امکان بعض دفعہ ہو سکتا ہے۔ الغرض رُوحانی تجربہ سے انکار یا اُن کے پیش کئے ہوئے مفادات سے سراسر مستفید نہ ہونے پر اصرار ایک ناقابلِ فہم بات ہوگی۔

رُوحانی تجربے کا منطقی جواز

ایک ہمہ گیر تجربے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ایک وہ حصّہ جس کا تعلّق مادّہ سے ہے اور دوسرا وہ حصّہ جس کا تعلق روح سے ہے۔ مادّہ سے جدید سائنسی علوم یعنی فزکس، کیمسٹری، حساب وغیرہ تعلق رکھتے ہیں اور رُوح سے مذہبیات کا تعلق ہے۔ اگر یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ صرف جدید سائنسی عُلوم یعنی فزکس، کیمسٹری، حساب وغیرہ ہی، جن کا تعلق مادّہ سے ہے، حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں اور رُوح یا مذہبیات کسی طرح حقیقت کی نفی ہیں تو یہ نظریہ صحیح نہ ہوگا۔ اِسی طرح اگر یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ صرف رُوح اور مذہبیات کے ذریعے ہی حقیقت کو پایا جا سکتا ہے اور یہ کہ جدید سائنسی عُلوم جو مادّہ پر ریسرچ کرتے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتے یا ہمیں حقیقت کی طرف لے جانے کی بجائے غلط راستے پر ڈالتے ہیں، تو یہ بھی صحیح نظریہ نہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مادّہ اور رُوح دونوں ہمیں حقیقت کی راہ ہی دکھاتے ہیں۔ اِن دونوں حصّوں پر ریسرچ کرنے والے علوم بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مل جاتے

ہیں اور یکساں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مختلف سائنسی علوم بہت سے گدھوں کی مانند ہیں جو فطرت کے مُردہ جسم پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اُس کے گوشت کا کچھ ٹکڑا لے اُڑتا ہے۔ ان سب ٹکڑوں کو یکجا رکھ کر دیکھا جائے تبھی اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ گویا حقیقت کے ہمہ گیر علم کی یہ علوم مختلف شاخیں ہیں جنہیں مختلف سائنسی علوم نے ایک ایک کر کے تخصیص کے ساتھ اُس میں مہارت حاصل کی ہے یعنی (SPECIALISE) کیا ہے۔ اِس کے برعکس مذہبیات جس کا تعلق روح سے ہے مکمل حقیقت تک یکجا طور پر ہمیں پہنچاتی ہے اور اس طرح جملہ سائنسی علوم کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اور دونوں قسم کے علوم کو ایک دوسرے سے خائف ہونے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔

مادہ پرستی کی دوڑ میں ہم اس قدر سرگرم ہیں کہ اپنی روحانی قوتوں کے اردگرد جو ہمارے اندر ہی موجود ہیں ایک پردہ سا ڈال دیتے ہیں جو ہمیں ان قوتوں سے بیگانہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف انتہا درجے کی عبادت۔ ریاضت یا یوں کہہ لیجئے کہ مذہبی جذبے سے سرشار سوچ ہی ہے جو ہمیں ہماری خودی کی گہرائیوں یا روحانی گہرائیوں تک پہنچا دیتی ہے اور ہم حقیقت کو یعنی صحیح راستے کو پا لیتے ہیں۔ گویا مذہبی تجربہ یا روحانی تجربہ جو ظاہر ہے کہ ایک نہایت نیک جذبے سے کیا جائے اور جس میں بنی نوعِ انسان کی بھلائی مضمر ہوگی صحیح مقام کے لئے یعنی اپنی منزل معلوم کرنے کے لئے ایک (SHORTCUT) ہے۔ اِس کے ذریعے مشکل اور اَدق مسائل کے بنے بنائے حل روحانی طور پر ترقی یافتہ بزرگوں کو مل جاتے ہیں۔ ان حلوں کا کوئی سائنسی جواز ہم فوراً پیش کر سکیں یا نہ پیش کر سکیں لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ حل درست ہیں اور آئندہ چل کر کسی مرحلہ پر اُن کا سائنسی جواز بھی معلوم ہو جاتا ہے جو سائنسی ریسرچ ہی کی بنا پر ہوتا ہے اور اس طرح مذہبی تجربے اور سائنسی علوم کی یکسانیت کا ثبوت بھی بہم پہنچتا ہے۔

پُرانے زمانے میں یعنی جب جدید عُلوم نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی روحانی ترقی کی مثالیں اکثر و بیشتر سامنے آتی تھیں۔ پیغمبروں کے وُرود کے علاوہ صُوفیا اور دیگر بزرگوں کی آمد اس دُنیا کے مختلف خطّوں میں اِس امر کا ثبوت ہے۔ اِس کا جواز یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کا شعور اور سمجھ بوجھ یعنی (INTELLECT) تب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مادّہ کی ریسرچ کی بنا پر یعنی جدید سائنسی عُلوم کے سہارے ہم تسخیرِ فطرت کا عمل جاری رکھتے۔ جدید سائنسی علوم اِس ترقی یافتہ حالت میں جیسا کہ اب ہیں، تب نہ تھے۔ لہٰذا رُوحانی ترقی کا راستہ اختیار کیا گیا اور پُرخلوص ریاضت اور بنی نوعِ انسان کی فلاح کے جذبے سے بھرپور سوچ بچار کی قوتوں کو مکمّل طور پر بروئے کار لایا گیا۔ جملہ پیغمبروں کی زندگی میں طویل المیعاد ریاضت اور سوچ بچار کے مرحلے ہمیں ملیں گے۔ جن کے بعد بنی نوعِ انسان کی نجات کی راہ اُنہیں دکھائی گئی۔ یہ پیغمبروں ہی کا حصّہ ہے کہ صحیح راستہ پا لینے کے بعد انہوں نے اِسے اپنے آپ تک محدود نہ رکھا بلکہ تجربے کے لئے بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کیا۔ اُس کی مخالفتوں کے زخم اُٹھائے لیکن صبر و استقامت سے اپنی نیک راہ پر قائم رہے۔ اور بالآخر انسان کی تقدیر پلٹنے کا باعث بنے۔ صوفیا اور بزرگوں کی رُوحانی ترقّی کا راز بھی ریاضت، عبادت اور سوچ بچار ہے اس کے علاوہ پیغمبروں کی تعلیمات بھی اُن کے سامنے ہوتی ہیں۔ اُن کی روشنی میں وہ اِن تعلیمات کی صحیح تفسیر پیش کرتے ہیں۔ اور نئی سے نئی لوق صورتوں اور مسائل کا حل اپنی سوچ بچار اور نیک جذبے کے نتیجے کے طور پر دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ البتّہ اُن کا مرتبہ پیغمبروں سے کم ہے چونکہ پیغمبر تو کسی مذہبی کتاب کی تجدید کا باعث نہیں بنتے بلکہ از سرِ نو ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہمارے سامنے پیش کر کے نئے حالات کے مطابق ہمیں سُنہری راستہ دکھاتے ہیں۔ پس مذہبی یا روحانی تجربے سے انکار صرف اِس وجہ سے کہ اب جدید عُلوم بہت ترقّی کر چکے ہیں غلط ہے۔ ہو سکتا ہے اب رُوحانی تجربے کی ضرورت نہیں

کم محسوس ہوتی ہو چونکہ جدید سائنسی علوم اکثر و بیشتر ہماری مدد کو حاضر ہوتے ہیں لیکن اِن کے روحانی تجربے کی موجودگی میں ممکن بلکہ ضروری اضافی امر ہے۔ اور یہ دونوں قسم کے تجربے ایک دوسرے کے نفی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے نتائج کے لئے اثبات کی صورت پیش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جانچ پڑتال اِن سے کی جا سکتی ہے۔

علاّمہ اقبال فرماتے ہیں اگر تجربے کے مادّی اور روحانی حصّے کا فلسفیانہ دلائل کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اصل حقیقت یعنی الٰہیّت ایک منطقیانہ طریقہ پر چلائی گئی تخلیقی زندگی ہے۔ اِس زندگی کی الٰہیاتی خودی کے طور پر توضیح کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آدمی کی شکل دی جا رہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ کوئی بھی اُس کی برابری کرنے والا نہیں؟ وہ سُنتا ہے اور دیکھتا ہے!! کوئی بھی خودی فطرت کے یکساں اُصولِ فطرت کے بغیر نہیں ہوتی۔ قدرت یا NATURE (نیچر) الٰہیاتی خودی کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو کردار، انسانی خودی کے لئے رکھتا ہے۔ اِس طرح علاّمہ اقبال نے جو نظریہ قائم کیا ہے اُس سے طبیعاتی سائنس کے ایک نئے روحانی معنی نکلتے ہیں نیچر یا قدرت یا فطرت کا حُصولِ علم اللہ تعالیٰ کے رویے یا اُصول کے عِلم پر مہارت حاصل کرنے کے مُترادف ہے۔ قُدرت کے مطالعہ کے وقت ہم الٰہیاتی خودی سے شناسائی حاصل کر رہے ہوتے ہیں اور یہ عبادت کی ایک اور شکل ہے پس علاّمہ اقبال ثابت کرتے ہیں کہ مادی تجربہ اور روحانی تجربہ ایک ہی تجربے کے دو حصّے ہیں اور ایک دوسرے سے غلط ملط ہوتے نظر آتے ہیں۔

قانونِ قدرت ہے کہ ہر چیز میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ گویا الٰہیاتی خودی تبدیلیوں کا منبع ہے۔ لیکن اِس تبدیلی سے یہ مُراد نہیں کہ تبدیلی تنزّل کی طرف ہو۔ تخلیقی کاروائی سے مُراد یہی ہے کہ ہر لمحہ تخلیق کا عمل جاری ہے اور بہتر سے بہتر صورتِ حال تائیدِ ایزدی سے اِس کائنات میں

وجود میں آرہی ہے۔ لہٰذا انسانی خودی پر بھی لازم ہے کہ ہر لحظہ بہتر سے بہتر صورتِ حال کے لئے کوشاں رہے۔ کسی ایک منزل کو حاصل کرنے کے بعد اُسی کو آخری منزل نہ سمجھ لیا جائے بلکہ نئی سے نئی تعمیری منزلیں اپنے پیشِ نظر رکھی جائیں اور پہلے سے زیادہ بلند مطمحِ نظر ہونا چاہیئے۔

پس تجرباتی واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حقیقت کی اصل صورت روحانی ہے اور اُسے ایک خودی کے طور پر ہی سمجھنا چاہیئے لیکن مذہب کی توقعات فلسفہ کی توقعات سے بلند تر ہوتی ہیں۔ فلسفہ اشیا کا ذہنی یا شعوری جائزہ لیتا ہے اور اس طرح تجربہ کی وسیع آماجگاہ کو ایک محدود سسٹم یا فارمولا میں لے آنے سے آگے نہیں بڑھتا۔ گویا یہ حقیقت کو ایک فاصلے سے دیکھتا ہے۔ مذہب، حقیقت سے انتہائی قُرب کا رشتہ پیوست کرتا ہے۔ فلسفہ کو آپ تصوری سمجھیئے اور مذہب کو زندہ تجربہ۔ اس قُرب کو حاصل کرنے کے لئے عبادت یا ریاضت یا دلی جذبے سے بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسانی شخصیّت کی بے پناہ قوّت

علاّمہ اقبال نے انسانی شخصیّت یا خودی یا انا کی قوّتوں کو مکمّل طور پر بروئے کار لانے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اپنے خیالات میں جگہ جگہ اِس نکتہ کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اپنی ذاتی محنتِ شاقہ، جہدِ مسلسل اور زیرکی سے اس دنیا بلکہ کائنات کا مشکل سے مشکل مرحلہ انسانی گرفت میں آسکتا ہے۔ ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ انسان شروع وقتوں اور مشکلوں سے کسی طرح ہمت نہ ہارے بلکہ زیادہ سے زیادہ جوشِ ہمت اور قابلیّت سے قدم آگے کی جانب ہی بڑھائے اور اِس امر پر مکمّل یقین رکھے کہ کامیابی اُس کا مُقدّر بن کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شخصیّت یا خودی کی قوّتیں عطا کر کے ایسی عظیم عنایات کی ہیں کہ ہم اُنہیں بروئے کار لا کر خود اپنی، اپنے خاندان کی، اپنے مُلک کی بلکہ ساری دُنیا کی قسمت ہی بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ حکیم میں فرمایا کہ بلاشک ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور پہاڑوں کو تجویز کیا کہ بارِ امانت (شخصیّت کا) اُٹھائیں لیکن اُنہوں نے اِس بوجھ کو اُٹھانے سے انکار

کر دیا۔ آدمی نے یہ بوجھ اُٹھانا منظور کیا لیکن وہ غیر منصف اور کم عقل ثابت ہوا۔ قرآنِ حکیم میں مزید آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر اپنی جگہ کسی کو (بطور نائب کے) بھیجنے والا ہوں۔ اِس پر فرشتوں نے عرض کی کہ کیا تو ایسی مخلوق کو وہاں بھیجے گا جو وہاں بدی پھیلائے گی اور خون بہائے گی۔ جب کہ ہم تیری مدح اور ثنا خوانی کے لئے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا بلاشک میں جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اور میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں یعنی انسانوں کو اس دُنیا میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔

پس ظاہر ہوا کہ انسان اِس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب یا نمائندہ ہے اُسے شخصیت یا خودی کی بے پناہ قوتیں تفویض کی گئی ہیں جنہیں بروئے کار لاتے ہوئے اُسے اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے آپ میں پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جن کا جگہ جگہ ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ اگر انسان مکمل طور پر اُن صفات کے حصول اور تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں جہدِ مسلسل نہیں کرتا۔ اگر وہ عدل و انصاف سے کام نہیں لیتا۔ اگر وہ عقل و شعور کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتا تو وہ ظالم یا جاہل نہیں تو اور کیا ہے۔ منصور حلاج نے اگر انا الحق کا نعرہ لگایا یا دیگر صوفیا نے اِسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ وہ خود خُدا ہیں یا یہ کہ خُدا کی کوئی ہستی نہیں بلکہ اِس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس دُنیا میں ہمیں اپنا نائب بنا کر تلقین کی ہے کہ ہم اُس کی صفات کو اپنانے کے لئے اپنی پوری قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور اِس طرح اپنی ذاتی جملہ انسانیت کی اور کائنات کی تقدیر بدل کر رکھ دیں۔ صوفیا کے اقوال کو غلط مطلب پہنانا یا انہیں صحیح طور پر نہ سمجھنا تو ہماری اپنی جہالت ہے۔ خیال کی جس معراج تک وہ لوگ یعنی صوفیا پہنچ گئے اگر ہم لوگ وہاں نہ پہنچ سکیں تو اِس میں سوائے ہمارے اور کس کا قصور ہو سکتا ہے۔ اگر اپنی شخصیت یا خودی کی بے پناہ قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اِس دُنیا میں اپنا نائب بناتے وقت مرحمت

کیں ہم کام میں نہ لائیں تو ہم جاہل نہ ہوئے تو کیا ہوئے۔ علامہ اقبال نے اِس امر پر زور دیا ہے کہ صوفیا کے اقوال کو (RATIONALISE) کرنا چاہیئے یعنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور محض اِس وجہ سے کہ وہ صوفیا کے اقوال ہیں اور آج کل صوفی ازم کا زمانہ نہیں اُنہیں رد کر دینا قرینِ انصاف نہیں چونکہ تاریخ اور مطالعۂ قدرت کے ساتھ ساتھ اندرونی گہری سوچ بچار جو اللہ سے لو لگا کر اُس کی مخلوق کی فلاح کے لئے کوئی نیک شخص کرے، اُس میں بھی نیک مقاصد حاصل کرنے کے لئے نہایت اعلیٰ وارفع ذریعے حیران کُن حد تک موجود ہوتے ہیں۔ اُن کی سچائی کا بظاہر ثبوت یا توجیہ خود اُن کا زمانہ یا اُن کے بعد کا زمانہ بھی دے سکے یا نہ دے سکے لیکن اُن کی سچائی اور درستی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی نہ کبھی اُن کی سچائی کی توجیہ ہمارے سامنے آجائے گی۔ گویا ریاضت اور گہری سوچ بچار یعنی صُوفی ازم کے ذریعے اکثر اوقات کسی مُشکل مسئلے کے بنے بنائے حل ایسے مِلتے رہے ہیں جن کی تاریخ شاہد ہے اور علامہ اقبال کے لفظوں میں پیغمبری کی ایک جھلک سمجھنا چاہیئے۔ اگرچہ پیغمبری کا رُتبہ اُن صُوفیاء کو حاصل نہیں ہوتا۔ مُلّا ازم کے البتہ علامہ اقبال بہت خلاف ہیں اور مُلّائیت سے اُن کی مُراد ایسے ناسمجھ اور کم عقل مُلّا ہیں جو غُلامی میں سجدے کی اجازت ہونے کو ہی آزادی کے مُترادف سمجھتے ہیں۔

مغربی عالموں نے بھی شخصیت اور خودی کے مُشکل مسئلہ کو چھان بین کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اُن میں سے برڈلے اور نیٹشے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے شُبہات کے باوجود خودی کے وجود اور ارتقا کو تسلیم کیا ہے۔ اُن کے اور علامہ کے عقائد میں جن کی بُنیاد اسلامی اعتقادات پر ہے کافی فرق ہے لیکن اُنہوں نے اِس بڑی حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ خودی کے ارتقا میں ہی فلاحِ انسانی کی تکمیل مُضمر ہے مثلاً نیٹشے کا فلسفہ ہے کہ اِس دُنیا کے آثار اور چڑھاؤ

سب بار بار آتے اور جاتے ہیں۔ ہر طرح کا مدّ و جزر جو اب آتا ہے پہلے بھی اپنی باری پر آچکا ہے۔ گویا ہر بلندی اور ہر پستی پہلے ہی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اپنی اپنی باری پر ایک مشینی انداز میں آتی اور جاتی ہے۔ حتیٰ کہ (SUPERMAN) کی آمد و رفت بھی مشینی انداز میں جاری ہے اور اپنے وقت میں اُسے آنا ہی آنا ہے لہٰذا اُس کے لئے جدّ و جہد کیا کرنی۔ اِس کے برعکس علامہ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ بلندیوں اور پستیوں کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ہماری جدِ مسلسل اور سعیٔ ناتمام جاری رہنی چاہیئے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ صرف انہی تک اکتفا کرنا مردِ مومن کی شان نہیں۔ گویا انسانیت کی تکمیل ابھی کسی مرحلہ پر بھی نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ نئی سے نئی بلندیاں اور تسخیرِ کائنات کے نئے سے نئے پہلو جہدِ مسلسل کے نتیجے کے طور پر ہمارے منتظر ہیں۔ انسان کا نہ ختم ہونے والا انعام اُس کی خودی کی بھرپور صلاحیتوں پر کنٹرول حاصل کر لینا ہے قیامت کا منظر بھی ایسے خود آگاہ شخص کے اعتماد اور یقین کو ہلا نہیں سکتا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں پیغمبرِ اسلام کی انتہائی بلندی پر پہنچی ہوئی خود آگاہی سے متعلق فرمایا ہے کہ اُس کی آنکھ ایک طرف کو نہ ہوئی اور نہ ہی اپنے راستے سے بھٹک سکی۔ اسلام میں مردِ مومن کی یہی شان ہے۔ ایک فارسی شاعر نے آنحضرت صلعم کے الٰہیاتی تجربے کو بہت خوب بیان کیا ہے۔

موسیٰ زِ ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسّمی

(ترجمہ: حضرت موسیٰ صفاتِ الٰہیہ کے ایک ہی جلوے سے بیہوش ہو گئے۔ تو (یعنی پیغمبرِ اسلام) تو خود ذاتِ الٰہیہ کا پرتو ہے کہ اُسے دیکھ رہا ہے اور تبسم میں ہے)

دوزخ اور جنّت کا تصوّر بھی اِسلام میں اِسی انداز سے آیا ہے کہ اُس سے شخصیت اور خودی کے ارتقا پر انسان آمادہ ہو۔ دوزخ سے یہ مُراد نہیں کہ ہمیشہ کے لئے کسی دہکتے ہوئے

کنوئیں میں کسی بد انسان کو ڈال دیا جاتا ہے جہاں سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باہر نہیں نکل سکتا۔ بلکہ اس کا مفہوم بھی اصلاحی ہے۔ یہ سزا کا ایک PERIOD یعنی وقفہ ہے جس میں بد کردار انسان اپنی شخصیت کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر قابو میں لانے کے قابل بن سکتا ہے۔ اسی طرح جنت بھی کوئی ہمیشہ کی چھٹی نہیں۔ ہماری جملہ کامیابیاں جو ہماری خود آگاہی کے بھرپور جذبے سے حاصل ہوتی ہیں نئی سے نئی خوشیاں اور اطمینان ہمارے لئے پیدا کرتی ہیں اور اس طرح نئے سے نئے کامیاب قدم اُٹھانے پر ہمیں اُکساتی ہیں۔

سپنسر SPENGLER نے اپنی کتاب (DECLINE OF THE WEST) میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ قرآن نے انسان کو تقدیر کے تابع کر کے خودی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اسلامی اور قرآنی نظریہ تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ تقدیر سے مُراد یہ ہرگز نہیں کہ ہر شخص کی اچھی یا بُری قسمت اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل سے لکھ دی ہے اور اُسی کے مطابق اُس پر اچھائی یا بُرائی بیتتی ہے۔ اِس قسم کا نظریہ تو اُمویوں نے بھی حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد پھیلایا تھا کہ کربلا کے واقعات میں اُن کا کیا قصور۔ یہ تو اللہ میاں کی طرف سے روزِ ازل اُن کی تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ اگر یہ نظریہ مان لیا جائے تو پھر سزا و جزا کا مسئلہ کس طرح جائز ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کے لئے ذمہ دار ہے تو پھر ہمیں اچھے اعمال کی جزا کیوں ملے اور بُرے اعمال کی سزا کیوں ملے۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ کی طرف سے کوئی قسمت لے کر ہم پیدا نہیں ہوئے۔ نہ ہی کسی اچھے یا بُرے وقت کا پہلے معاملہ طے ہے۔ یہ ہمارے اپنے اعمال مجتمع۔ قابلیت اور خودی کی قوتوں کو بروئے کار لانے اور زیرکی کے استعمال پر منحصر ہے کہ اچھے یا بُرے واقعات رُونما ہوتے ہیں جن کے لئے ہم لوگ ذمہ دار ہیں۔ تقدیر کی قرآنی وضاحت محض یہ ہے کہ اگر ہم جہدِ مسلسل سے کام لیں

اور خود آگاہی اور خود شناسی کے میدان میں پیغمبرِ اسلام کی پیروی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بڑی سے بڑی مشکل پر قابو نہ پالیں اور ذاتی طور پر بہ حیثیتِ مجموعی انسانیت کو ایک نہایت ارفع و اعلیٰ مقام پر نہ پہنچا دیں۔ اسلام کو سب سے بڑا نقصان اُمویوں کے اِس نظریۂ تقدیر نے پہنچایا جو اُنہوں نے قتلِ حسینؑ و حسنؑ کو جائز قرار دینے کے سلسلے میں کئے۔ علامہ اقبال نے اِسلام کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں زیرِ نظر مقالے میں اِن اُمور کی بھرپور سعی کی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اُنہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم آہستہ آہستہ لیکن ایک عزم کے ساتھ جہالت کی اُس تاریکی سے نکل کر ترقی و تعمیر کی راہ پر گامزن ہیں۔

نظریۂ اجتہاد

اسلام میں زندگی کی بنیاد روحانی ہے جس میں ابدیت اور تغیر کے اجزا باہمی طور پر پیوست ہیں۔ ایک معاشرہ جو اِس حقیقت پر مبنی ہو اُسے ابدیت اور تغیر کی اِس حقیقت کو پہچان کر اُس سے مکمل طور پر استفادہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ ابدی اُصول کسی قسم کے تغیر کو برداشت نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تغیر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، تو یہ معاشرہ آگے کی طرف بڑھنے اور ترقی کرنے کی بجائے اپنی جگہ ہی جم جائے گا بلکہ اِس میں تنزل ہی کے امکانات پیدا ہوں گے اور ترقی کا دروازہ مسدود ہو کر رہ جائے گا۔

اجتہاد کے لفظی معنی ہیں جدوجہد کرنا۔ اسلامی قانون کی زبان میں اِس کے معنی ہیں کسی بھی قانونی معاملہ میں آزادانہ اور صحیح رائے قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ وہ لوگ جو سخت کوشش کرتے ہیں اُنہیں ہم اپنا صحیح راستہ دکھاتے ہیں جب رسولِ مقبول نے حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا تو حضور کے استفسار پر معاذ نے کہا کہ میں

معاملات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق کروں گا۔ حضور نے پوچھا" اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس امر سے متعلق کچھ نہ ہو تو پھر؟" اس پر معاذ نے جواب دیا کہ تب میں پیغمبر اسلام کی سُنّت پر عمل کروں گا۔ رسولِ مقبول نے پوچھا کہ اگر سُنّت میں بھی اس امر کے بارے میں کوئی واضح احکامات موجود نہ ہو؟۔ اس پر معاذ نے جواب دیا کہ اُس صورت میں مَیں اپنی بہترین رائے معلوم کرنے کے لئے جدّ و جہد کروں گا۔

پچھلی چند صدیوں سے اسلامی ممالک تنزّل کا شکار رہے ہیں جس کی ایک بڑی وجہ وہاں کے معاشرہ کے قوانین کی مُردنی تھی یعنی اُن میں کوئی حرکت یا آگے کی طرف بڑھنے کے لئے اجتہاد کا جذبہ موجود نہ تھا۔ اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

۱۔ عبّاسیوں کے زمانے میں اسلام میں منطقی احیا کی تحریک شروع ہوئی اس طرح دو مخالف فرقے وجود میں آئے۔ ایک تو قرآن کو ابدی تصوّر کرتا تھا جسے قدامت پسند نظریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا فرقہ یعنی اسلام کے منطقی اور شعوری احیا کا طبقہ اس سے اتّفاق نہ کرتا تھا اور اسے عیسائیت کا اثر قرار دیتا تھا۔ عبّاسی خلفا نے قدامت پسندوں کا ساتھ دیا۔ ایک تو اس وجہ ہی سے کہ اُن کے خیال میں اس تحریک سے اسلام کے بنیادی ڈھانچے ہی کے گر جانے کا اندیشہ تھا اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ اس سے شخصی حکومت پر زد پڑنے کا اندیشہ تھا کیونکہ اسلام کی اگر صحیح معنوں میں آزادانہ طور پر منطقی توجیہ کی جائے تو اس میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں چنانچہ منطقی احیا، کی تحریک کے علمبرداروں کو سختی سے کچلنے کی سعی کی گئی۔

۲۔ رہبانیتی تصوّف کے ارتقا سے، جو غیر اسلامی اثرات کی بنا پر وجود میں آیا، اسلام میں منطقیت یا جدیدیت کے رُجحان پر بہت بُرا اثر پڑا۔ رہبانیت کا اثر یہ ہوا کہ صُوفی بزرگ ایسا شخص ہی متصوّر ہونے لگا جو دُنیا و مافیہا کو چھوڑ کر صرف اللہ ہی سے لَو لگائے۔ یہ ظاہر ہے کہ

اُس کے خیال میں تو اللہ کی کتاب میں مختلف توجیہات کا ڈھونڈنا کفر نہیں تو اس سے کچھ کم معیوب ہی ہوگی۔ ظاہر ہے اِس زاویۂ نگاہ سے ترقی تو کیا ہوتی البتہ تنزل کی راہیں کھل گئیں۔ فعّال بننے کی بجائے سُست الوجودی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

۳۔ بغداد کی تباہی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ تاتاریوں کے بغداد پر غلبہ کے بعد اسلام کی بقا سے متعلق نا اُمیدی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اِس ڈر سے کہ اسلام کی اقدار میں مزید بربادی پیدا نہ ہو مسلمانوں نے یہ رویّہ اختیار کیا کہ اسلام کی قدیم شکل کو جُوں کا توں محفوظ رکھنے کی مکمل سعی کی جائے اور اُس کے کسی پہلو پر کسی قسم کا بیرونی اثر نہ پڑنے دیا جائے۔ غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا جو حال تھا اور جدید سائنسی علوم وغیرہ سے جس طرح اُنہوں نے بائیکاٹ کئے رکھا بالکل وہی حال عربوں کا بھی تھا۔ اجتہاد کا دروازہ اُنہوں نے اپنے اوپر خود مکمل طور پر بند کر لیا یہاں تک کہ وہ ترقی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ وہ یہ بھول گئے کہ تنزل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود اعتمادی سے بھرپور اور جد و جہد کے لئے ہر وقت آمادہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مکمل طور پر بندھے ٹکے نظام کی جس میں سرِ مو بھی فرق نہ کیا جا سکے۔ مثلاً اگر پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد کمال اتاترک اپنے مُلک کے احیاءِ نو کا بیڑا نہ اُٹھاتے اور اِس سلسلے میں ترکی سوسائٹی کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق نہ ڈھالتے تو ترکی قوم اپنی موجودہ حالت پانے کی بجائے بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ باقی پہلوؤں کو تو چھوڑیئے خود خلافت کے موضوع پر ہی ترکی کی قومی اسمبلی نے جو اجتہاد کیا وہ خالی از دلچسپی نہیں۔ سُنّی قانون کے مطابق کسی امام یا خلیفہ کا مقرر کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔ پہلا سوال اِس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خلافت ایک ہی شخص کے سپرد ہونی چاہیئے۔ اِس موضوع پر ترکی میں اجتہاد یوں ہوا کہ اسلام کی روح یہ ہے کہ خلافت یا امامت شخصِ واحد کی بجائے اشخاص کی

ایک جماعت کے سپرد کی جاسکتی ہے یا ایک ایسی اسمبلی کو یہ بار سونپا جا سکتا ہے جو باقاعدہ طور پر چناؤ کے ذریعے عمل میں آئی ہو۔ یہ رائے بالکل صحیح اور متوازن ہے۔ جمہوری طرز کی حکومت اسلامی روح کے عین مطابق ہے اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے خلافت سے متعلق شرط یہ تھی کہ خلیفہ خاندانِ قریش سے تعلق رکھتا ہو۔ شروع میں یہ شرط ضروری تھی چونکہ اسلام کے بانی مبانی اور بڑے بڑے علمبردار اہلِ قریش تھے لیکن بعد میں جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور بادشاہت دوسرے ملکوں اور خانوادوں میں چلی گئی تو خلافت کے عہدہ کا بھرم رکھنے کے لئے اس اصول میں یوں ترمیم کی گئی کہ جو اسلامی ملک سب سے زیادہ طاقتور ہو وہیں کا حکمران خلیفۃ المسلمین مانا جائے۔ گویا اسلام کے بنیادی اصول کے ڈھانچہ میں فرق لائے بغیر باقی تفاصیل میں زمانہ اور ضرورت کے مطابق ترمیم کی جانی عین جائز ہے۔ اس سلسلے میں باقی ہر دنیاوی معاملہ (EXTREMISIM) سے کام لینے کی ضرورت نہیں بلکہ (MODERATION) کا سنہری اصول اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں نہ یہ نظریہ درست ہے کہ اصول کی کسی بھی تفصیل میں سرِ مو فرق لانا کفر ہے اور نہ ہی یہ نظریہ درست ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کا ڈھانچہ بھی تبدیل کر دیا جانا چاہیئے۔ ان دونوں کے بین بین یہ زرّیں اصول ہی درست ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔

اصولِ فقہ کے تنقیدی تجزیہ سے متعلق علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل امور پیش کئے ہیں:۔

(۱) ہمیں یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ عباسی خاندان کے زمانے تک اسلام کا کوئی تحریری قانون علاوہ قرآنِ حکیم کے وجود میں نہیں آیا۔

(۲) دوسرے یہ امر قابلِ غور ہے کہ پہلی صدی کے وسط سے تقریباً چوتھی صدی کی ابتدا تک کم و بیش انیس سکول اسلامی قوانین کی رائے سے متعلق وجود میں آئے۔ صرف اسی سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ہمارے اُس ابتدائی زمانے کے اسلامی قانونی ماہرین کیسی سرگرمی سے نئے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلامی قوانین کے تنقیدی جائزہ پر مصروف کار تھے۔

(۳) جب ہم اسلامی قانون کے چار مانے ہوئے مواخذ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بحث خود بخود ختم ہو جاتی ہے چونکہ ان مواخذ میں سے ایک اہم ماخذ خود قیاس یا نظریۂ اجتہاد ہے۔

اب ہم اسلامی قوانین کے مختلف ماخذوں پر مختصراً بحث کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن:۔ اسلام کا بنیادی ماخذ قرآن ہے۔ بہر حال قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں ایک بلند تر شعور اس امر کا پیدا کرے کہ اس کا رشتہ اللہ سے اور کائنات سے کیا ہونا چاہیئے۔ بلاشبہ قرآن عام اُصول ضرور مرتب کرتا ہے جنہیں قانونی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کی تفاصیل بہر حال قانونی ماہرین ہی کو کرنی چاہئیں جو اسلامی علم و فضل سے مکمل طور پر بہرہ ور ہوں۔ قرآن میں جگہ جگہ فطرت کے تغیّر کا پتہ دیا گیا ہے اور ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ ہم فطرت کے تغیّر کا بغور مطالعہ کریں اور اُس سے مکمل طور پر استفادہ کریں۔ لہٰذا یہ امر نہایت غیر اسلامی ہوگا کہ ہم تغیّر کے لفظ سے ہی گھبرائیں۔ آخر ترقی و تعمیر میں بھی تو تغیّر ہی مضمر ہے۔

۲۔ حدیث:۔ حدیث کی اہمیت کے پس منظر میں یہ امر ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلعم نے انتظامی احکام ایک خاص سوسائٹی اور زمانے پر آزمائے تھے اور انہیں اُس وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا تھا۔ اسلام کے نئے سے نئے ملکوں میں پھیلنے اور ہر لحظہ زمانے کے تیزی سے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُن اُصولوں کی تفاصیل میں مناسب ردّ و بدل اور ترمیم لازمی ہو جاتی ہے ورنہ اسے یعنی اسلام کو صرف عرب بلکہ تجدد حجاز ہی کے لئے موزوں سمجھا جائے گا۔ پھر آنحضرت صلعم نے خود اپنے مقرر کردہ یمن کے

گورنر معاویہؓ کو تلقین کی کہ اگر اُس علاقے کے حالات کے مطابق قرآن اور حدیث میں احکام موجود نہ ہوں تو اپنے آزادانہ فیصلہ پر عمل کرو جس کی بُنیاد اجتہاد نہیں تو اور کیا ہے۔

۳۔ اجتماع :۔ اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجتماع ہے یعنی اجتماعی اتفاقِ رائے لیکن اِس سے یہ مُراد نہیں کہ اجتماعی اتفاقِ رائے اِسلام کے بُنیادی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہے۔ بُنیادی ڈھانچہ یا بُنیادی اُصول وہی رہیں گے البتہ اُن کی تفاصیل کے زمانے اور علاقے کے تقاضوں کے مطابق ہوں گی۔ اجتماع کے اسلام میں قانون کے اہم ماخذ ہونے سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام موجودہ جمہوری پارلیمانی نظام کے حق میں ہے۔

۴۔ قیاس :۔ فقہ کا چوتھا ماخذ قیاس ہے۔ اور اِس سے مُراد یہی ہے کہ اسلام کے بُنیادی تقاضوں کے مطابق اپنی آزادانہ رائے کا استعمال کیا جائے اور نئے اُصول وضع کئے جائیں۔ یہی اجتہاد کا بنیادی اُصول ہے۔

پس ظاہر ہوا کہ اجتہادِ اسلامی معاشرہ کی ترقی و تعمیر کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اگر اجتہاد کے دروازے ہم پر بند کر دیئے گئے تب تو اس سے مُراد یہ ہوئی کہ ہم اپنے ذہن و شعور کو زنگ لگا دیں۔ جدید علوم و فنون سے متاثر نہ ہوں چہ جائیکہ اُن سے استفادہ کریں۔ اور یہ کہ تنزل کی تاریکیوں میں مست رہ کر یہی سمجھتے رہیں کہ عینِ اسلام یہی ہے اور یہ کہ آخرت میں جنّت الفردوس کے مزے ہمارے ہی لئے مخصوص ہیں۔ واللہ اعلمُ بالصّواب۔

مُسلم کلچر

مُسلم کلچر اور ثقافت کے بُنیادی اُصولوں کی (RATIONAL INTERPRETATION) نئی منطقی توجیہ و تشریح جسے عقل و دانش کی کسوٹی پر صحیح طور پر پرکھا جا سکے، جس شاندار طریقے پر علامہ اقبال نے کی ہے وہ اُنہی کا حصّہ ہے۔ اسلام میں مذہبی افکار کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں اُن کے لیکچر ہمیں اسلامی کلچر کی صحیح رُوح سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایک تو ہم خود صدیوں سے ہر قسم کی اخلاقی، تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی پستی کے تعرِ گمنامی میں جا گرے تھے۔ خود ہم میں اِس قدر احساسِ کمتری جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہم مکمّل طور پر یہ فرض کئے ہوئے تھے کہ اسلامی کلچر اور مذہب یورپی کلچر اور مذہب کے مقابلے میں ایک نہایت ہی کمتر قسم کی چیز واقع ہوئی ہے تبھی تو ہم اُن کے ہاتھوں زک اُٹھائے ہوئے ہیں اور یہ کہ خدانخواستہ یورپی اقوام۔ تہذیب و مذہب کسی طرح ہم سے کسی آسمانی عنایت کے باعث بہت اعلیٰ و افضل ہیں اور یہ کہ ہماری قسمت ہی میں خواری اور بے چارگی ہے تبھی تو ہم ذلیل و خوار ہیں۔ پھر خود یورپی اقوام نے جن کا کلچر ہی بین الاقوامی استعمال

نوآبادیت اور نسلی امتیاز پر مبنی ہے، اپنے زہریلے اور گمراہ کُن پراپیگنڈے سے اپنی غلام قوموں کو یہ باور کرانے کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی کہ یورپ کا کلچر ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ہے علامہ اقبال کی مساعی نے جسے جہاد کا نام ہی دیا جانا چاہیئے یہ ثابت کر دیا کہ قدیم یونانی فلسفہ ہو یا جدید یورپی کلچر، اسلامی اقدار اور کلچر کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اور ہمیں اپنی فراموش کردہ اقدار کے زرّیں اُصولوں کو دوبارہ پاکر از سرِ نو ایک زرّیں اسلامی معاشرہ کی تشکیل پر زور دینا چاہیئے تاکہ ہم اپنا کھویا ہوا وقار اور گذشتہ عظمتیں پھر حاصل کر سکیں۔ انہوں نے مذہبِ اسلام کی جہالت پر مبنی تشریحات کی دھجیاں اُڑائیں چاہے وہ ہمارے اپنے ناسمجھ عُلما کی پھیلائی ہوئی تھیں یا یورپین عیّاروں کی کم فہمی یا دیدہ و دانستہ دروغ گوئی کا نتیجہ تھیں جن سے اُنہیں خود اپنے مقاصد حاصل کرنا مقصود تھا۔

سب سے پہلے ہمیں کلچر کی تعریف متعیّن کر لینی چاہیئے۔ کلچر کا لفظ بہت عام استعمال میں آتا ہے لیکن بعض دفعہ بہت کم اِس کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ کلچر کے ڈکشنری معنی ہیں ایک قسم کی تہذیب۔ اِس قسم کی توضیح یوں ہوئی کہ ایک معاشرہ جس قسم کے بُنیادی اخلاق۔ بین الاقوامی۔ اقتصادی۔ علمی اور مذہبی اُصولوں پر قائم ہے وہ اُس کلچر کی بُنیاد ہوئے اور اِن بُنیادوں پر قائم معاشرہ میں جس قسم کے روابط باہمی اور ترقی و تعمیر کے وسائل مُلک کے اندر اور مُلک کے باہر پیدا کئے جاتے ہیں وہ اُس مُلک کی تہذیب ثقافت یا کلچر ہوئے۔ کسی مُلک کے مختلف طبقوں میں معاشی اور سیاسی مساوات ہے یا نہیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات انصاف اور برابری پر مبنی ہیں یا نہیں۔ اقتصادی اور فوجی لحاظ سے مُلک مضبوط ہے یا نہیں۔ اور کون سے طریقے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کیئے گئے ہیں۔ یہ سب اُمور اُس قوم کے کلچر کا حصّہ ہیں اور اِسی روشنی میں ہمیں اِسلامی کلچر کا جائزہ لینا ہے جس کی صحیح روح علاّمہ اقبال نے نہایت احسن طریقے سے پیش کی ہے۔

اسلام نے ہمیں نبوّت کے خاتمے کا پیغام دیا۔ اِس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ بچّہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو والدین ہی اُس کے ہر قسم کے کام کرتے ہیں اُسے نہلانا۔ دُھلانا۔ کپڑے پہنانا۔ غرضیکہ اُس کا ہر قسم کا کام اُس کے والدین ہی کے سپرد ہوتا ہے۔ اِس کے بعد اُس کی تعلیم کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ تب بھی خرچ اُسے والدین ہی دیتے ہیں۔ اُس کی تعلیم میں بھی، سکول کے اساتذہ کے علاوہ، مُمد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سکول کے بعد کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ آتا ہے اور اِس سب دور میں وہ والدین ہی کے دستِ نگر ہوتے ہیں اور مُتواتر اُنہی کی عنایات کی اُمید پر اُن کے دن گذرتے ہیں۔ پھر اُن کی تعلیم ختم ہوتی ہے اور سروس یا کوئی اور کام کاج ڈھونڈنے کا وقت آتا ہے۔ تب بھی وسائل کے نہ ہونے کی پریشانی کے باعث وہ والدین پر ہی بوجھ رہتے ہیں اور اُن کی عنایات کے صدقے ہی دن گذرتے۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُنہیں مکمل طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر اُنہیں والدین ایسا کرنے پر مجبور نہ کریں تو خود اُن کی زندگی ناکامیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا مجموعہ بن جائے گی اور پکی پکائی نعمتوں کی متواتر اُمید اُن کے لئے نعمت نہیں بلکہ ایک تباہ کُن اور مہلک حادثہ بن جائے گی۔ یہ اُصول نہ صرف انسانوں میں بلکہ جانوروں میں بھی ملاحظہ کیا گیا ہے۔ کُتیا اپنے نومولود بچّوں کو کس مادرِ نعم سے پرورش کرتی ہے۔ اُنہیں چومتی چاٹتی ہے۔ اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ اُنہیں خوراک بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن جونہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی چمٹے رہنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے تو کُتیا اُنہیں مار پیٹ کر بڑی سختی سے الگ کر دیتی ہے۔ باقی جانوروں میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے۔ انسانیت کی ابتدا سے ظہورِ اسلام کے زمانے تک انسانیت بھی یوں سمجھیئے کہ اپنے بچپن کے زمانے سے گذر رہی تھی۔ اُس میں اِتنی عقل و دانش ابھی پیدا نہ ہو سکی تھی کہ وہ

مظاہرِ فطرت پر قابو پانے کی سکت اپنے آپ میں پاتی۔ چنانچہ مختلف پیغمبر مختلف زمانوں اور معاشروں میں بھیجے گئے تاکہ وہ انسانیت کے لئے اُس کے خالق کی طرف سے رہبری کریں اور اِس سلسلے میں مُرتّبہ اُصول وضوابط اُن تک پہنچائیں۔ اِس طرح متواتر رہبری اور رہنمائی کے بعد بالآخر اسلام کے ظہور تک اللہ تعالیٰ نے اپنی رہنمائی کی تکمیل کردی۔ قرآن کی ترسیل اور آنحضرت صلعم کی نبوّت میں رہبری کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رکھا گیا اور نبوّت کے خاتمے سے یہ پیغام دیا گیا کہ اب انسانیت کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا وقت آچکا ہے۔ اُس کی تربیت اور رہبری مُکمّل ہوچکی اور اب خود اُسے اپنی محنت و مُشقّت اور اپنے وسائل کو بروئے کار لاکر خود اپنی ترقی و تعمیر کی تکمیل کرنی ہے۔ اور کسی غیبی رہبری و رہنمائی کی مزید کسی اُمید پر بیٹھے نہیں رہنا ہے۔ سو نبوّت کے اِس خاتمے کی تھیوری سے اگر کوئی مسلمان یہ سمجھے کہ نبیٔ آخرالزماں ہمیں یہ ضمانت دے گئے ہیں کہ اِس دُنیا اور آخرت میں اب وہی ہمارے رکھوالے اور محافظ ہیں اور یہ کہ ہمیں اُنہی کی غیبی امداد پر سہارا کئے ہوئے خود کچھ ہمت نہیں کرنی تو یہ بالکل غلط قسم کی توجیہ و تشریح ہے بلکہ اِس کے بالکل برعکس جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یہ ایک پیغام ہے ہمیں خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا۔

تقدیر اور قسمت سے متعلق بھی ایک بالکل غلط قسم کا مفہوم ہمارے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے آجکل کے مسلمان بہت زیادہ تقدیر پرست ہوچکے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی اِن کی انتہائی پستی کا باعث ہے۔ یوروپین مُحقّقوں اور عالموں نے بھی اسلامی کلچر میں تقدیر کے صحیح معنی نہیں سمجھے اور اُنہوں نے بھی تقدیر کے عام بازاری معنوں ہی کو اپنا کر اسلامی کلچر کا یہ اہم پہلو غلط طریقے پر پیش کیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ یعنی انسان کی تقدیر تبھی بدل سکتی ہے جب وہ خود اِس

کے لئے جدوجہد کرے۔ اب اگر ہم اس آیت کی تشریح یوں کریں کہ انسان کا کام صرف کوشش کر دینا ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہی ہے یعنی ایک دفعہ کوشش میں ناکامی کو قسمت کی خرابی یا تقدیر کے سازگار نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کوشش و ہمت کو ہی چھوڑ دینا اور سمجھنا کہ یہ عین اسلامی شان ہے تو یہ بالکل غلط مفروضہ ہے۔ اس آیت کا صحیح مفہوم اور اسلامی کلچر کی روح یہ ہے کہ ہر مشکل پر قابو پالینا ہماری تقدیر ہے اور اُس کے لئے جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے راستے کی رُکاوٹ کتنی ہی بڑی سے بڑی کیوں نہ ہو اُس پر قابو پالینا مردِ مومن کی تقدیر ہے۔ البتہ طریقہ کار یہ ہے کہ جتنی بڑی مشکل ہو اُسی قدر زیادہ ہمت اور محنت اور پامردی، ہوشیاری اور زیرکی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم غلام رہے تو اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ خود ہماری کوتاہیوں اور خامیوں کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص اور ہر قوم کے لئے یکساں وسائل پیدا کئے ہیں۔ اگر ہم اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اُن سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی قسمت پر الزام دھریں تو ہم اسلامی ثقافت پر نہیں بلکہ کافرانہ ثقافت پر انحصار کیے ہوئے ہیں۔

قدیم یونانی معاشرہ کا انحصار زیادہ تر تھیوری پر تھا۔ اُن کے فلاسفروں کی بنائی ہوئی THEORIES جو غیر محسوس اجزا پر بنائی گئی تھیں اُس زمانے اور علاقے میں درست ثابت ہوئی ہوں گی لیکن اُن کوجوں کا توں ہر زمانے اور ہر علاقے میں منطبق کرنا درست نہیں اس کے برعکس اسلام حقائق اور ہر زمانے اور ہر علاقے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اِس میں DOGMATIC یا تھیوری پر مکمل انحصار کی گنجائش نہیں بلکہ PRAGMATIC یعنی ہر تھیوری کی عملی صورت مُرتّب کرنے پر جو حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی گئی ہو، اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اِسی وجہ سے اجتہاد کا نظریہ اسلامی کلچر کا ایک اہم اُصول ہے۔ اسلام ایک جامد مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک اور ہر لحظہ آگے کی طرف حرکت کرنے والا فعّال مذہب ہے۔ لہٰذا گرد و پیش کے

حالات کا مطالعہ کرنا ہر ترقی یافتہ معاشرہ کے اچھے پہلوؤں سے خوشہ چینی کرنا اور بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرکے اُن سے علیحدگی اختیار کرنا اور اسلام کی اُصولوں کی وقت اور علاقے کی مناسبت سے جدید سے جدید منطقی تشریح پیش کرنا اسلام کا بنیادی اُصول ہے۔ اگر قرآن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اُس کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں گذشتہ علمائے دین کی تفاسیر سے سرِمُو بھی اختلاف کفر ہے تو یہ تھیوری بذاتِ خود کُفر ہوگی نہ کہ اِس کے برعکس۔ باقی علوم کی طرح دین بھی ایک مُتحرک علم ہے اور اِس حیثیت سے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اِس کی متحرک توجیہات اور تشریحات جو اجتہاد پر مبنی ہوں انتہائی ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک کارخانہ میں اگر ہر سال یا ہر عہد میں اگر ہم جدید ترین مشینری نصب نہ کرتے جائیں تو بہت جلد وہ اِتنی (OUT DATED) یعنی وقت سے پیچھے رہ جائے گی کہ دیگر جدید ترین مشینریوں سے لیس کارخانوں کا مقابلہ ہرگز نہ کرسکے گی اور بالآخر اپنی موت آپ مرجائے گی۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ہر مشینری کی جانچ پرکھ اُس کا فرض ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی مشینری اندھا دھند فیکٹری میں لگادی جائے تو اِس کی ترقی کی بجائے اِس کی تباہی کا باعث ہو۔ اجتہاد کے لئے (INDUCTIVE INTELLECT) یعنی تجرباتی عقل و شعور کو کام میں لانا اور معاشرے کی فلاح کے لئے اِسلامی اُصولوں میں جدید ترین تقاضوں کی روشنی میں نئے معنی ڈھونڈنے کے لئے جدوجہد کرنا ہی اجتہاد ہے اور عین اسلامی کلچر کا حصّہ ہے۔

قرآن کی تعلیمات میں منطقی دلائل اور تجربے پر بہت زور دیا گیا ہے اور اِسی طرح مظاہرِ فطرت اور تاریخ کے مطالعہ اور اُن سے سبق سیکھنے کا جابجا انتہائی پُرزور الفاظ میں ذکر ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ جدید علوم جن سے یوروپی اقوام نے اس قدر زیادہ ترقی کی ہے بلا واسطہ اِسلامی کلچر کے اثر کے ذریعے ہی اُن تک پہنچے ہیں اور اگر ہم اُنہیں محض یوروپین الاصل

سمجھتے ہوئے اُن سے خواہ مخواہ کنارہ کشی اختیار کرلیں تو یہ کوئی اسلام نہیں۔ اِس کے برعکس اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ جدید علوم کی اصل یورپ ہی سے منسوب ہے تو بھی اسلام ہرگز یہ نہیں سکھاتا کہ ہم اُن سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ علم چاہے چین ہی سے کیوں نہ حاصل ہونا ہو ہم وہاں بھی جائیں اور اُس سے استفادہ کریں۔ غرض جدید علوم کا بغور مطالعہ کرکے اُن میں سے مفید اور کارآمد چیزوں سے خوشہ چینی کرلینا عین اسلامی رُوح کے مطابق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم اُنہیں جُوں کا توں آسمانی صحیفہ ہی مان لیں بلکہ اپنی عقل و فہم کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے ہم اُن میں مزید اضافہ اور بہتری کی صورت پیدا کرسکتے ہیں تاکہ مظاہرِ فطرت پر مکمل طور پر قابو پانا ہمارا مُقدّر بن سکے۔

اسلام شہنشاہیت اور کلیسائیت پر یقین نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلعم نے بادشاہت کو ختم کیا اِس کے ساتھ ساتھ کلیسائیت اور رہبانیت کی بھی مذمّت کی۔ یہ دونوں ادارے یورپ کی تہذیب کے بُنیادی سُتون ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ نسلی امتیاز اور قوم پرستی اُن کا شِعار ہے۔ قرآن نے اِس کی بھی مذمّت کی۔ یورپ کے اِسی معاشرہ کی وجہ سے اُن کے اپنے مُلک میں بھی غریب طبقوں کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ اور ان کے علاوہ غیر ملکوں میں بھی نسلی برتری کا بہانہ بناکر غریب اور کمزور اقوام کا خون نہایت بے دردی و سفّاکی سے لامذہبیت کے نام پر چُوسا گیا۔ اسلام بادشاہت۔ کلیسائیت اور لامذہبیت اور نسلی امتیاز سب کے خلاف ہے۔ خلافتِ راشدہ کا زرّیں عہد ہمارے لئے ایک شاندار اور مُنوّر مثال ہے جو مندرجہ بالا اُصولوں کے پیشِ نظر وضع کیا گیا تھا اور جس میں فلاحی معاشرہ کی بُنیاد عدل و مساوات پر رکھی گئی تھی۔

اگرچہ نبوّت کا خاتمہ آنحضرت صلعم کے ظہور اور قرآن حکیم کے ورود کے ساتھ ہوچکا ہے لیکن صوفیانہ تجربہ ختم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کا ایک طویل سلسلہ اسلام میں آنحضرت صلعم کے بعد

ظہور پذیر ہوا جنہوں نے روحانی پاکیزگی اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور ریاضت۔ عبادت اور سوچ بچار کا ایک طویل مرحلہ طے کیا اور اپنی اندرونی آواز پر لبیک کہتے ہوئے لوگوں کے لئے مختلف دُنیاوی و دینی مقاصد کے حصول کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ قرآن نے نفس یعنی اپنی ذات اور آفاق دونوں کو علم کے اہم ذرائع قرار دیا ہے۔ یعنی جیسے ہم مظاہرِ فطرت اور آفاقی عناصر کے مطالعے سے اپنی بہتری کے لئے علوم و فنون حاصل کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ سے لَو لگا کر اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر اگر گہری سوچ و بچار کسی مشکل مسئلے پر کی جائے تو اللہ تعالیٰ اُس نیک شخص کو روشنی اور ہدایت سے نوازتا ہے اور اگر وہ اُن تجلیاتی ہدایات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر انسانیت کے سامنے پیش کرے تو اُس کی خدمات قابلِ قدر ہوں گی اور یہ بھی حصولِ علم کا ذریعہ ہے۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ جذبات کو مکمل طور پر استدلال سے بدل دینے کا حکم ہے۔ بلکہ استدلال کے ساتھ جذبات کو بھی اپنا پارٹ ادا کرنا ہے۔ جدید عُلوم کے ساتھ ساتھ رُوحانیت سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ استدلال کی کسوٹی کا یہ فائدہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی بھی نظریہ کو چاہے وہ رُوحانیت کی سیڑھی کے ذریعے حاصل ہوا یا جدید علوم کے ارتقا کے باعث پرکھا جا سکتا ہے اور کھوٹے اور کھرے کی تمیز کی جا سکتی ہے۔ پس صوفیانہ تجربات ایک کاملاً قدرتی تجربہ ہیں جن سے استفادہ کرنا ہمارا حق ہے اور اُن پر اعتقاد نہ رکھنا ایک حتمی علم سے استفادہ نہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسلام میں صوفی اِزم نے صوفی تجربات کو باقاعدہ ترتیب دے کر ایک خصوصی علم کی شکل دی ہے۔ ابنِ خلدون نے اِسے مکمل طور پر سائنسی اُصولوں پر اُستوار کیا۔

انہی زرّیں اُصولوں کے تتبع میں جن کا اوپر ذکر کیا گیا دُنیائے اِسلام میں سلسلہ ہائے صُوفیا کے شاندار کارناموں کے علاوہ علمِ حساب، علمِ نجوم، علمِ طب، علمِ فلسفہ۔ اِستدلال اور دیگر جدید علوم

میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ بہت حد تک انہی کے اثر کی مرہونِ منت ہے۔ نظّام نے سب سے پہلے یہ اُصول وضع کیا کہ شک کا اُصول ہی ہر علم کی ابتدا ہے۔ غزالی نے اِس کی مزید توضیح کی۔ علومِ دینیات کے اِحیا کے سلسلے میں اپنے اُصول وضع کئے اگرچہ وہ استدلال کے فن میں ارسطو کا پیرو کار تھا۔ ابنِ حزم اور ابنِ تیمیہ نے استدلال کے میدان میں البیرونی اور القندی نے نفسیات کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ابنِ ہیثم اور ابنِ حرم نے علومِ سائنسِ چشم کے سلسلے میں اور اِسی طرح سینکڑوں مسلمان سائنس دانوں نے دُنیائے اسلام کی رہبری کی جس سے چار دانگِ عالم میں اسلام کا ڈنکا بجا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اب ہم دوبارہ اپنی مسلسل جدوجہد سے اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل نہ کر سکیں۔ صرف ہمتِ مردانہ کی ضرورت ہے اور احساسِ کمتری کو ختم کرنے کی۔

شاعر کا خواب

علّامہ اقبال نے اگرچہ اِتنی عمر نہ پائی کہ وہ پاکستان کو اپنی نظروں کے سامنے بنتا ہوا دیکھ سکتے۔ لیکن پاکستان کا قیام بہت حد تک اُنہی کی کوششوں کا مرہونِ منّت ہے۔ جہاں اپنی شاعری کے ذریعے علّامہ نے مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا اور اُنہیں بحیثیت فرد اور ملّت اپنے اِحیاء او پر اُکسایا۔ وہاں اُنہوں نے اسلامیانِ ہند کے لئے ایک الگ وطن کے قیام کا تصوّر بھی پیش کیا۔ کون جانتا تھا کہ شاعر کا یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ اُن کا سیاسی شعور منّاتی منجھا ہوا تھا اور وہ مُسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہوئے اور مختلف اجلاس میں اپنے خُطبات صدارت میں اُنہوں نے اِس علیحدہ مُلک کے قیام کی پیش گوئی اِتنے واضح طور پر اور اتنے درست طریقے پر کی ہے کہ اُن کے خیالات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آنے والے واقعات کیسے آئینے کی طرح اُن کی نظروں کے سامنے واضح تھے۔ یا یوں کہئے کہ اُنہوں نے حالات کے دھارے کو اِس طرح دِلی جذبے کے ساتھ پھیر دینے کی سعی کی جس میں بالآخر مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی

ہوئی اور شاعر کا خواب پورا ہو کر رہا۔ موت سے پہلے علامہ اقبال نے قائدِ اعظم سے متاثر ہو کر کئی بار اُن کا ذکرِ خیر کیا اور اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کیں۔ اُن کی یہ اُمیدیں بھی کس قدر درست ثابت ہوئیں کہ پاکستان کا قیام یعنی شاعر کے خواب کی تعبیر اُنہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد مورخہ دسمبر ۱۹۳۰ میں اُنہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں واضح طور پر اپنے خواب کی تصویر پیش کی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ مذہب کو ایک نجی معاملہ سمجھنا غلط ہے اور اگر ایسا سمجھا گیا تو اسلام کا بھی وہی حشر ہو گا جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اُس کے نظامِ سیاست کی بجائے اُن قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں۔ اجتماعی ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دُنیائے مادیت سے مُنہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ رُوحانیت پر جمالی ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآنِ پاک میں اظہار ہوا اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ اِن کا تعلق صرف صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو لیکن اِس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر اُن کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اِس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اوّلین نتیجے سے ایک ایسے نظامِ سیاست کی بُنیاد پڑی جس کے اندر قانونی تصورات مُضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اِس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی بُنیاد وحی والہام پر ہے۔ لہٰذا

اِسلام کے مذہبی نصب العین اُس کے معاشرتی نظام سے جو خود اُسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ جو کسی وطنی یا قومی اُصول پر ہو جو اِسلام کے اُصولِ اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔

مشہور فرانسیسی عالم RENAN (رینان) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اُس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اُس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور اُن کے دِلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو اُنہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے اِس لئے کہ اِس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اِس کے جذبات و احساسات کی دُنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دینِ الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام النّاس میں مقبول ہو جائیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اِس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جماعتوں میں اِس قسم کا کوئی رُجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ ہر مجموعہ مُضطرب ہے کہ اِس کی ہیئتِ اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اِس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیتِ ہند کا اتحاد اُن تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ اُن کے

تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبّر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصولِ مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتاً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریقۂ کار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے اُن سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔

اِن حالات کی روشنی میں علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اِس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیتِ ہند کا اتحاد اِسی اُصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہلِ ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدّن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مُشابہ ہے لیکن اِس کا دوسرا حصہ اِن قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک و تعاون کی کوئی مؤثر راہ نکل آئی تو اُس سے نہ صرف اِس قدیم مُلک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصۂ دراز سے مصائب و فتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اِس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عُقدہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اُن کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملّتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اِسلامی ہندوستان قائم کریں۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اِسی نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملّتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر اُن سے ایک مُتوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے

ساتھ اپنی اِن صلاحیتوں کو جو اُن کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا کہ ذاتی طور پر میں اِن مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اِس کے باہر۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اِس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکینِ مجلس نے اِسے اِس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اِس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اِس کا رقبہ اِس قدر وسیع ہوگا کہ اِس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکینِ مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اِس ریاست کے باشندوں کی تعداد اِس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اِس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اِس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر اِن اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اِس تجویز کو سُن کر نہ انگریز کو پریشان ہونا چاہیئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دُنیا میں سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اِس مُلک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اِس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقہ کا مرکزیت کی بدولت جس نے دولتِ برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اِس قابل بنایا کہ وہ اِس مُلک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، بلکہ اِس سے خود مسلمانوں کے احساساتِ ذمہ داری قوی

ہو جائیں گے اور اُن کا جذبۂ حُب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اِس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوونما اور ارتقا میں آزادانہ قدم اُٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزورِ قوت ہو یا بزورِ خیالات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صد ہے اور اگر فوجِ ہند کی کل تعداد میں سے ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فی صدی ہو جائے گی حالانکہ اِس اندازہ میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبۂ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اِس سے آپ اُن تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مُسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر مُلکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامُون رکھ سکتی ہے۔

علامہ اقبال نے اِس سلسلے میں ہندوؤں کے خدشات کو ختم کرنے کی سعی میں فرمایا کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار رُوسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے پیوستہ نہیں بلکہ وہ ایک رُوحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اُس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اُس اختتامیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا فرض تھا کہ سُود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اِس کے کہ اسلام میں سُود لینا حرام ہے، اسلامی حکومت نے شرح سُود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اُس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

اپنے خطبہ کے دوران ایک اور جگہ سندھ کے صوبۂ بمبئی سے علیحدہ کیے جانے کے حق میں اُنھوں نے یوں دلائل دیئے:۔

احاطۂ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ اہلِ سندھ کی زندگی اور اُن کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ مُلک ہے جو مملکتِ اسلامی سے قریب تر ہے۔" سب سے پہلے اُموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پُشت افریقہ کی جانب ہے اور مُنہ عرب کی جانب۔ مُناسب ردّ و بدل کے ساتھ یہی بات سندھ کے مُتعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور مُنہ وسطِ ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان نزاعی مسائل کا جن سے حکومتِ بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں اور اُس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے، اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا تو صاف نظر آتا ہے کہ اس کو احاطۂ بمبئی سے مُلحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور رہے گا۔ بیشک اس وقت بمبئی کا رویّہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس

راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں لیکن ابھی تک تو کوئی مستند بیان نظر سے نہیں گذرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اِس قسم کی مشکلات موجود ہیں لیکن اِس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومتِ ہند اُمید افزا صوبہ کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

غرض علامہ اقبال کے سیاسی نظریات اِسلامیانِ ہند کے مستقبل کے مرتبے سے متعلق نہایت بلیغ اور دُور رَس تھے۔ اُنہوں نے حالات کی نبض پر صحیح جگہ ہاتھ رکھا اور مسلمانوں کو وہ نصب العین دینے میں انتہائی جرأت مندی اور بالغ نظری کا ثبوت دیا جن کو اپنا کر بالآخر اِسلامیانِ ہند نے اپنے لئے ایک علیحدہ وطن تعمیر کر لیا اور اِس طرح شاعرِ مشرق کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوا۔

● **ملک محمد عظیم** : ۱۷ مئی ۱۹۲۹ء پیلی بھیت (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن ضلع راولپنڈی ہے۔ گھر والد ریلوے میں ملازم تھے جس کے باعث ہندوستان کے مختلف شہروں میں رہے اور گریجویشن پنجاب اور کراچی یونیورسٹی سے مکمل کی۔ مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد انکم ٹیکس کی ملازمت چھوڑ کر راولپنڈی میں (۱۹۵۵) اسی اے سی متعین ہوئے، تب سے پاکستان کے بیشتر شہروں میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں مقرر، مضمون نگار، ایڈیٹر، بہترین کھلاڑی تھے۔ تب سے اب تک علمی، ادبی ذوق کی تکمیل میں مضمون نگاری کرنے کے ساتھ علمی مجلسوں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ "رہِ وادیِ خیال" کے نام سے تنقیدی مقالات کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔

● **لطیفہ خانم صدیقی (بیگم ملک محمد عظیم)**

۱۹۳۳ میں فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) میں پیدا ہوئیں۔ والد ڈاکٹر تھے۔ جو بریلی سے بہ سلسلہ ملازمت بلوچستان میں تعینات رہے ابتدائی تعلیم یوپی (بھارت) میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم گرلز ہائی سکول سے میٹرک، گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ایف۔ اے سنٹرل گورنمنٹ کالج فار ویمن کراچی سے بی اے اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور کچھ عرصہ گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ میں بطور لیکچرار کام کیا۔ دوران تعلیم مضمون نگاری، ایڈیٹر اور طلبا کی انجمنوں کی لیڈر رہیں۔

۱۹۵۶ میں محمد عظیم ملک سے شادی ہوئی۔ قیام راولپنڈی کے دوران اپوا کی سرگرم کارکن اور پراپیگنڈہ سیکرٹری تھیں، پھر سیالکوٹ، گجرات میں بھی ایسی ہی خدمات انجام دیتی رہیں۔

اس سے پہلے اپنے گرامی قدر شوہر کی علمی ادبی تحریروں میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی ہیں۔ البتہ اس کتاب میں ان کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

چار بچوں سعد عظیم، وقار عظیم اور دو بچیوں شہلا عظیم اور تسنیم عظیم کی ماں ہیں ٭